جماعت ہائے احمدیہ انگلستان کے بائیسویں
جلسہ سالانہ ۱۹۸۷ء کا ایک منظر۔ امام جماعت احمدیہ
حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کا خطاب

ماہنامہ ربوہ

خالد
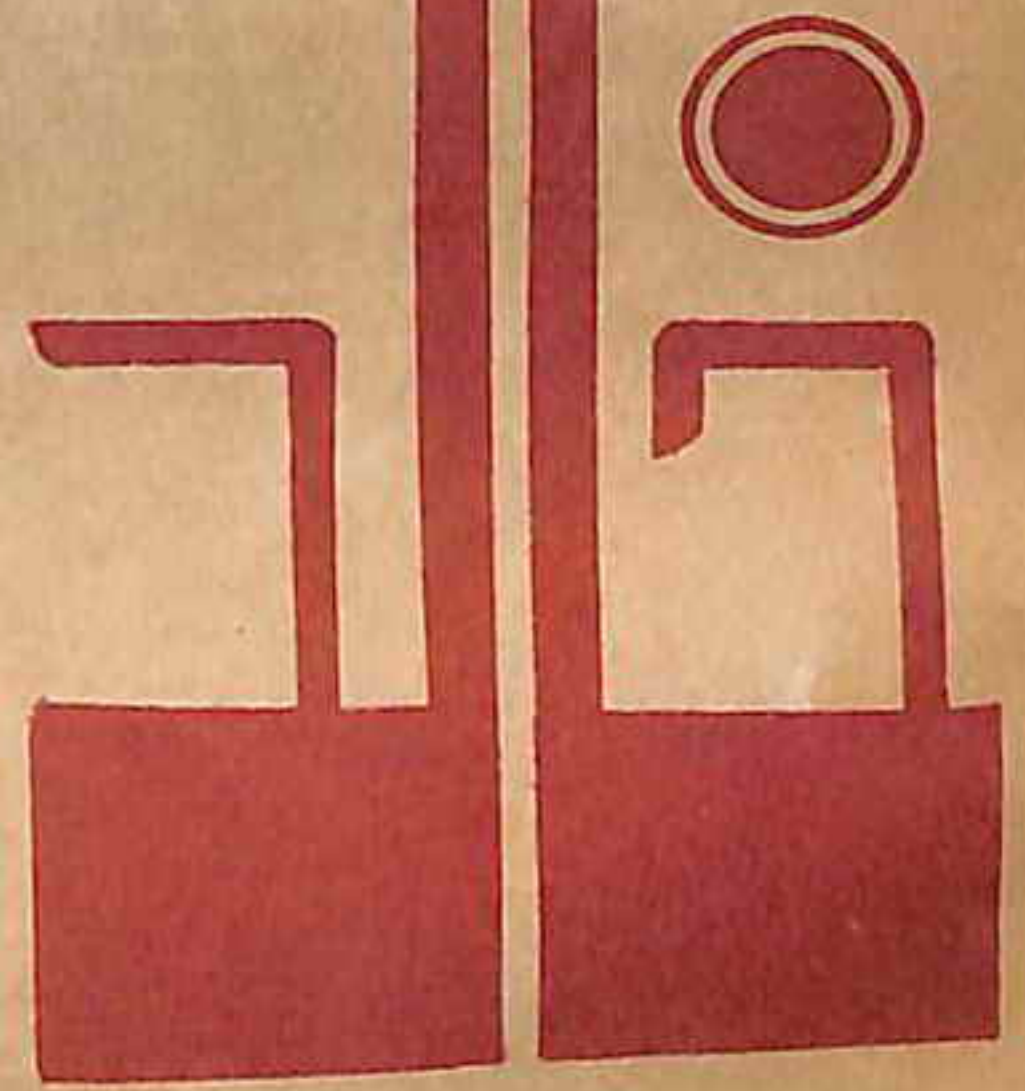
ستمبر ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر
عبدالسمیع خان

تم چلے آئے میں نے جو آواز دی، تم کو مولا نے توفیقِ پرواز دی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
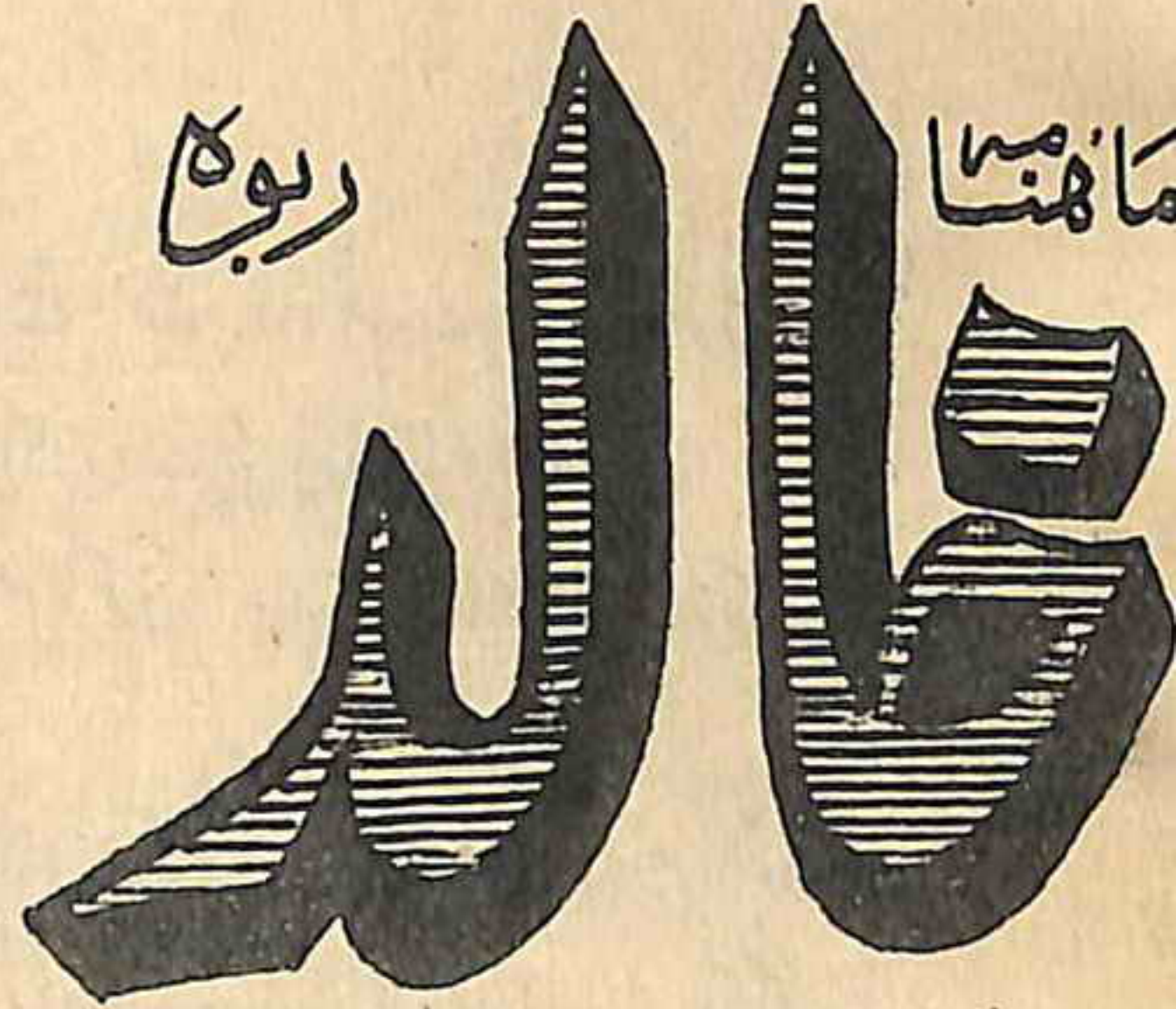
تبوک ۱۳۶۶ہش ستمبر ۱۹۸۷ء
جلد ۳۴ شمارہ ۱۱

(ایڈیٹر)
عبدالسمیع خان

قیمت:
ماہانہ .... ۲ روپے ۵۰ پیسے
سالانہ .... ۲۵ روپے
ممالک بیرون ...... ۱۵۰ روپے

اس شمارہ میں

اداریہ:-

جواہر پارے

بشارات:-

سائنس:-

سیر گلستاں:-

طب و صحت:-

اخبارِ مجالس:-

آخری صفحہ:-

پبلشر: مبارک احمد خالد؛ پرنٹر: قاضی منیر احمد؛ مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ؛
مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد دارالصدر جنوبی ربوہ؛ رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۸۳۰

اداریہ

حوصلہ

۱۴۵ ہجری میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں حکومت کے خلاف علم بلند کیا تو اپنے وقت کے عالم بے بدل اور مشہورِ زمانہ فقیہ حضرت امام مالک رح نے بھی اُن کی حمایت کی۔ لوگوں نے انہیں خلیفہ منصور کی بیعت کا حوالہ دیکر یاد دلایا تو فرمایا :۔

"منصور نے جبراً بیعت لی ہے شریعت میں جبراً کرائے جانے والے کام کا کوئی اعتبار نہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے زبردستی طلاق دلوائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔"

گورنرِ مدینہ جعفر نے جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی تھا آپ کو بہت دھمکایا اور کہا کہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں۔ مگر امام مالک رح بدستور یہ اعلان فرماتے رہے۔ جس پر آپ کو پابجولاں گورنر کے سامنے لایا گیا اور اس کے حکم سے آپ کے جسم سے کپڑے اُتروا کر بڑی بے دردی سے ستر کوڑے مارے گئے جس سے آپ کی پُشت لہولہان ہوگئی اور دونوں مونڈھے اُتر گئے۔ مگر اللہ رے آپ کی حق گوئی اور بے باکی کہ آپ ہر کوڑے کی ضرب پر بلند آواز سے فرماتے تھے جبری طلاق حرام ہے۔

جعفر نے غصہ میں کوڑوں کی سزا کے بعد آپ کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر بٹھا کر سارے شہر میں گھمایا۔ امام مالک رح زخمی حالت میں اونٹ کی ننگی پُشت پر شہر کے بازاروں میں سے گزر رہے تھے اور بآوازِ بلند یہ اعلان فرما رہے تھے :۔

"جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ مَیں مالک بن انس ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری طلاق جائز نہیں۔"

سزا کے بعد اسی حالت میں انہی خون آلود کپڑوں کے ساتھ مسجد نبویؐ میں تشریف لائے۔ خون صاف کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔

اہل اللہ کی عجیب شانِ مردانگی اور وسعتِ حوصلہ ہوتی ہے۔ جب خلیفہ منصور کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوا اور جعفر کو معزول کر دیا۔ اور حضرت امام مالک رح سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ جعفر کو سزا دے گا۔ مگر آپ نے فرمایا :۔

"انتقام کی ضرورت نہیں، مَیں نے جعفر کو خدا اور رسولؐ کی خاطر معاف کر دیا ہے۔"

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے الفاظ میں!

"حسین رضی اللہ عنہ طاہر مطہر تھا اور بلاشبہ وہ اُن برگزیدوں میں سے ہے جن کو خدا تعالیٰ اپنے ہاتھ سے صاف کرتا ہے اور اپنی محبت سے معمور کر دیتا ہے اور وہ بلاشبہ سردارانِ بہشت میں سے ہے اور ایک ذرہ کینہ رکھنا اس سے موجبِ سلبِ ایمان ہے۔ اور اس امام کی تقویٰ اور محبتِ الٰہی اور صبر اور استقامت اور زُہد اور عبادت ہمارے لئے اُسوۂ حسنہ ہے اور ہم اس معصوم کی ہدایت کے اقتداء کرنے والے ہیں جو اُس کو ملی تھی۔ تباہ ہو گیا وہ دل جو اس کا دشمن ہے اور کامیاب ہو گیا وہ دل جو عملی رنگ میں اس کی محبت ظاہر کرتا ہے اور اس کے ایمان اور اخلاق اور شجاعت اور تقویٰ اور استقامت اور محبتِ الٰہی کے تمام نقوش انعکاسی طور پر کامل پیروی کے ساتھ اپنے اندر لیتا ہے۔ جیسا کہ ایک صاف آئینہ ایک خوبصورت انسان کا نقش۔ یہ لوگ دُنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ کون جانتا ہے ان کا قدر مگر وہی جو انہی میں سے ہیں۔ دنیا کی آنکھ ان کو شناخت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ دنیا سے بہت دُور ہیں۔ یہی وجہ حسین رضؓ کی شہادت کی تھی کیونکہ وہ شناخت نہیں کیا گیا۔ دنیا نے کس پاک اور برگزیدہ سے اس کے زمانہ میں محبت کی تا حسین رضؓ سے بھی محبت کی جاتی۔

غرض یہ امر نہایت درجہ کی شقاوت اور بے ایمانی میں داخل ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کی تحقیر کی جائے۔ اور جو شخص حسینؓ یا کسی اور بزرگ کی جو ائمہ مطہرین میں سے ہے تحقیر کرتا ہے یا کوئی کلمہ استخفاف کا اس کی نسبت اپنی زبان پر لاتا ہے وہ اپنے ایمان کو ضائع کرتا ہے کیونکہ اللہ جلشانہٗ اس شخص کا دشمن ہو جاتا ہے جو اس کے برگزیدوں اور پیاروں کا دشمن ہے۔"

(تبلیغ رسالت جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۲۔ اشتہار ۸ راکتوبر ۱۹۰۵ء)

- "امام حسین رضؓ کا مظلومانہ واقعہ خدا تعالیٰ کی نظر میں بہت عظمت اور وقعت رکھتا ہے۔" (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۶۸ حاشیہ)
- "اس میں کس ایماندار کو کلام ہے کہ حضرت امام حسین اور امام حسن رضی اللہ عنہما خدا کے برگزیدہ اور صاحبِ کمال اور صاحبِ عفت اور ائمۃ الہدیٰ تھے۔" (تریاق القلوب صفحہ ۱ حاشیہ)
- "مَیں یقین رکھتا ہوں کہ کوئی انسان حسین رضؓ جیسے یا حضرت عیسیٰؑ جیسے راستباز پر بدزبانی کر کے ایک رات بھی زندہ نہیں رہ سکتا اور وعید مَنْ عَادَ وَلِيًّا لِي دست بدست اس کو پکڑ لیتا ہے۔" (ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۳۸)

حضرت امام حسینؓ کو ایک لازوال عظمت عطا ہوئی

از افاضات سیدنا حضرت مصلح موعود

"اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید حاصل کرنے کے لئے نبوت شرط نہیں بلکہ یہ کامل مومن کو حاصل ہو سکتی ہے۔ دیکھو حضرت امام حسینؓ نبی نہ تھے اور بظاہر ان کو یزید کے مقابلہ میں شکست بھی اٹھانی پڑی۔ یزید اس وقت تمام عالمِ اسلام کا بادشاہ تھا۔ اور اس وقت چونکہ تمام متمدن دنیا پر اسلامی حکومت تھی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام دنیا کا بادشاہ تھا۔ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک دنیا پر اس کے رشتہ داروں کی حکومت رہی۔ اور اُس وقت منبروں پر حضرت علیؓ اور آپ کے خاندان کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ یزید کو اتنی بڑی حکومت حاصل تھی کہ آج کل کسی کو حاصل نہیں۔ آج انگریزوں کی سلطنت بہت بڑی سمجھی جاتی ہے مگر ذرا مقابلہ کریں تو بنو امیہ کی حکومت سے جس کے خاندان کا ایک فرد یزید بھی تھا انگریزوں کی حکومت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ فرانس سے شروع ہو کر سپین، مراکو، الجزائر، طرابلس اور مصر سے ہوتی ہوئی عرب، ہندوستان، چین، افغانستان، ایران، روس کے ایشیائی حصوں پر ایک طرف اور دوسری طرف ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے یورپ کے کئی جزائر تک یہ حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ اس قدر وسیع سلطنت آج تک کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ موجودہ زمانہ کی دس پندرہ سلطنتوں کو ملا کر اس کے برابر علاقہ بنتا ہے اور اتنی بڑی سلطنت کا ایک بادشاہ ہوتا تھا جن میں سے قریباً ہر ایک حضرت علیؓ اور آپ کے خاندان کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اس لئے منبروں پر کھڑے ہو کر ان کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ساری دنیا میں امام حسینؓ کی عزت پھر قائم ہوگی۔ اور اس وقت کوئی وہم بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یزید کو بھی لوگ گالیاں دیا کریں گے۔ مگر آج نہ صرف تمام اس علاقہ میں جہاں امام حسینؓ کو گالیاں دی جاتی تھیں بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی (کیونکہ بعد میں اسلامی حکومت اور بھی وسیع ہو گئی تھی گو وہ ایک بادشاہ کے ماتحت نہ رہی) سب جگہ یزید کو گالیاں دی جاتی ہیں اور حضرت امام حسینؓ کی عزت کی جاتی ہے۔ آپ ایک برگزیدہ انسان تھے اور حق کی خاطر کھڑے ہوئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی دی۔ بظاہر دشمن یہ سمجھتا ہوگا کہ اس نے آپ کو شہید کر دیا مگر آج اگر یزید دنیا میں واپس آئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت نہیں کہ مُردے دنیا میں واپس آئیں) تو کیا تم میں سے کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ یزید ہونے کو پسند کرے گا۔ جس دن حضرت امام حسینؓ شہید ہوئے

وہ کس قدر غرور اور فخر کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھتا ہوگا اور اپنی کامیابی پر کس قدر نازاں ہوگا۔ لیکن آج اگر اُسے اختیار دیا جائے کہ وہ امام حسینؓ کی جگہ کھڑا ہونا چاہتا ہے یا یزید کی جگہ تو وہ بغیر ایک لمحہ کے توقف کے کہہ اُٹھے گا کہ میں دس کروڑ دفعہ امام حسینؓ کی جگہ کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ غرض کسی اور سے فیصلہ کرانے کی ضرورت نہیں اگر یزید خود آئے تو اس کا اپنا فیصلہ بھی یہی ہوگا۔" (الفضل ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء)

قاتلانِ حسینؓ کا انجام

از میاں عبدالرشید

میدانِ کربلا میں ایک شخص عبداللہ بن جوزہ نے سیّدنا حسینؓ کے سامنے آکر آپ کی شان میں نازیبا کلمات کہے۔ سیّدنا حسینؓ نے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ! اِسے دوزخ میں داخل کر۔" ابن جوزہ غصّے سے بے قابو ہوگیا۔ اتنے میں اس کا گھوڑا بدکا اور وہ گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑا مگر اس کا ایک پاؤں رکاب میں اٹکا رہا۔ گھوڑا سرپٹ بھاگتا گیا اور ملعون ابن جوزہ کا سر پتھروں اور درختوں سے ٹکراتا رہا اور اسی حالت میں وہ جہنّم واصل ہوگیا۔

مسروق بن وائل حضرمی نے اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسے سیّدنا حسینؓ کا سر مل جائے، تو اسے ابن زیاد کے پاس لے جاکر انعام حاصل کرے مگر ابن جوزہ کا خوف ناک انجام دیکھ کر وہ یزیدی لشکر چھوڑ کر واپس کوفہ چلا گیا۔

سیّدنا حسینؓ کے قاتلوں میں سے کوئی بھی عذابِ الٰہی سے بچ نہ سکا۔ بعض کو قتل کی سزا ملی بعض اندھے ہوگئے۔ بعض دردناک امراض میں مبتلا ہوئے۔ بعض مجنون اور مخبوط الحواس ہوکے مرے۔ جن لوگوں نے اقتدار کے نشہ میں آپ پر مظالم ڈھائے تھے وہ جلد ہی اقتدار سے محروم ہوگئے۔

عبدالملک بن مروان کے دَورِ حکومت میں جب مختار بن ابی عبید ثقفی نے کوفہ کی حکومت سنبھالی تو اُس نے ایسے لوگوں کو جو سیّدنا حسینؓ سے لڑنے والی فوج میں شامل تھے، چُن چُن کر قتل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے ایک دن میں ایسے ۲۴۰ دوسو چالیس لوگوں کو جہنّم واصل کیا۔ عمرو بن الحجاج زبیری کوفہ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا مگر مختار کے آدمیوں نے اُسے ڈھونڈ نکالا اور تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ شمر ذی الجوشن نے بھی بھاگ کر جان بچانی چاہی مگر پکڑا گیا اور اُسے قتل کرکے اُس کی لاش کو کتوں سے پھڑوا دیا گیا۔

قاتلانِ حسینؓ گرفتار کرکے مختار ثقفی کے سامنے پیش کیے جاتے تو وہ انہیں انتہائی اذیت دیکر قتل کراتا۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا اور انہیں سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیتا اور بعض کو زندہ آگ میں

جناب یعقوب امجد (کھاریاں)

جذبۂ اشتیاق

مہر و وفا کی راہ میں گر سر کٹیں، تو ہم
زنہار اپنی گردنیں ہونے نہ دیں گے خم

جذبۂ اشتیاق سے ہے دل میں اضطراب
اسکو بڑھاتے جائیں گے ہونے نہ دیں گے کم

وہ کجروی سے باز نہ آئے، تو دیکھنا!
بڑھتی رہیں گی نفرتیں محفل میں دمبدم

دار و رسن کو چوم کر بڑھتے ہی جائیں گے
اس راہ سے ہٹے گا نہ اپنا تو اب قدم

لوٹی گئی ہیں بزم کی رعنائیاں تمام
دل رو رہے ہیں اپنے تو آنکھیں ہوئی ہیں نم

نغمہ کہاں یہ نوحہ ہے گلشن کی لوٹ کا
بتلا رہے ہیں آپ ہی نغمے کے زیر و بم

کتنے ہی بے گناہوں نے سینچا ہے خون سے
امجدؔ، بہاراں آئے گی گلشن میں لاجرم

حضرت امام جماعتِ احمدیہ کے خطبات کا خلاصہ

خلاصہ خطبہ جمعہ ۱۴ اگست ۸۷ء

حضور نے سورۃ النساء کی آیات ۹۶، ۹۷ کی تلاوت فرمائی اور ان کی روشنی میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مجاہدین کو جو اپنے اموال اور جانوں کے ذریعہ جہاد میں مصروف ہیں قاعدین یعنی پیچھے بیٹھنے والوں پر غیر معمولی شاندار درجہ عطا فرمایا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی رحمتوں کی بارشیں ہوں گی۔ ان کے لیے لامتناہی درجات کا سلسلہ جاری فرما دیا ہے۔ کسی ایک خاص فضل کی طرف اشارہ نہیں بلکہ اس میں یہ بتایا ہے کہ یہ مقام خاص ہے جس میں دوسرے ان کے ساتھ شامل نہیں ہیں۔

حضور نے فرمایا ان آیات میں قتال والے جہاد کا ذکر نہیں کیونکہ قتال والے جہاد میں بیٹھے رہنے والوں کے لیے سخت تنبیہہ اور وعید ہے لیکن یہاں جن قاعدین کا ذکر ہے ان کے لئے وعید نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کو حسنہ سے باہر رکھا گیا ہے۔ بلکہ جملہ معترضہ کے طور پر یہ آیت آئی ہے کہ ان لوگوں سے بھی خدا تعالیٰ کے حسنِ سلوک کا وعدہ ضرور ہے۔

اس کے بعد اگلی آیات کی روشنی میں بتایا کہ یہاں چار گروہوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک وہ گروہ ہے جو ظلموں سے مرعوب ہونے کی بجائے دین کا پیغام پہنچانے میں خدا تعالیٰ کی خاطر مالی اور جانی قربانی کرنے میں، خدا تعالیٰ کی خاطر ہر قسم کے دُکھ اٹھانے میں صفِ اوّل کے مجاہد ہیں جن کے اخلاص میں کوئی مشکلات اور مصائب حائل نہیں ہوتے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو دین پر قائم رہتا ہے لیکن عملاً قربانی میں آگے نہیں بڑھتا۔ مجاہدین کے لئے دعائیں بھی کرتا ہے لیکن ایسے خاص دَور میں جانی اور مالی قربانی کی توفیق اُسے نہیں ملتی۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو ظلموں سے مرعوب ہو کر دین کو نقصان پہنچا دیتے ہیں باوجودیکہ استعداد رکھتے ہیں، ہجرت نہیں کرتے۔ مالی فوائد یا نقصانات کے احتمالات ان کو ہجرت سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت وعید ہے۔

چوتھا گروہ وہ ایسا ضعیف اور بے بس ہے کہ نہ دین کو بچا سکتا ہے اور نہ ہجرت کی طاقت پاتا ہے۔ ان کے متعلق بعید نہیں کہ خدا تعالیٰ اُن سے حُسنِ سلوک کا معاملہ کرے۔ عمومی مدد کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا ہے۔

حضور نے فرمایا ان ساری آیات میں جو مضمون ہے وہ ایک ظلم اور تشدد کے ماحول کا نقشہ سامنے لاتا ہے۔ جس میں خدا کے بندے مجبور اور بے طاقت، کئی قسم کے ظلموں کا نشانہ بنائے جا رہے ہوتے ہیں اور ان کا عمل مختلف ہوتا ہے۔

حضور نے بتایا کہ ان آیات میں زندہ رہنے کے گر سکھا دیئے گئے ہیں اور ذمہ دار منتظمین میں سے دو گروہوں کا بھی ان آیات میں ذکر ہے۔

حضور نے فرمایا ہمارے امراء اور صدر صاحبان اور دیگر عہدیداران کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ مومنوں کے دو پہلے درجات کا اس آیت میں ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جو ہر حال میں، ہر مشکل کے وقت سابقون میں شامل رہتے ہیں اور خدمت دین سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ بہت سے امراء اور صدر صاحبان اُن کے حال پر نظر رکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ جو خدمت کر رہے ہیں یہی کافی ہے۔ حالانکہ ایک اور طبقہ بھی ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے یعنی قاعدین کا طبقہ جو ایمان کے لحاظ سے زخمی تو نہیں ہوتے لیکن عملاً عظیم قومی جہاد میں شامل بھی نہیں ہوتے۔

حضور نے بتایا کہ منتظمین کی اکثریت دوسرے طبقہ کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اُن پر کام نہیں کرتی۔ جس کی وجہ سے وہ جماعتیں مقامی اعتبار سے ترقی نہیں کر پاتیں۔ خوابیدہ لوگوں کو بیدار کرنے اور صفِ اوّل میں لانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

بعض جماعتوں کے امراء مسلسل یہ خیال رکھتے ہیں کہ پیچھے رہنے والوں کو محنت کر کے آگے لایا جائے اور انہیں عظیم الشان درجات سے محروم نہ رکھا جائے تو ان کی حالت بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بسا اوقات صدر جماعت کو بنے بنائے مخلصین مل جاتے ہیں، وہ انہیں پر خوش رہتا ہے اور خود نئے مخلص بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

حضور نے فرمایا ہمیں اس وقت صفِ اوّل کے مومنین کی ضرورت ہے کیونکہ مشکلات اور مصائب بڑھتے جا رہے ہیں۔ کچھ ظاہر ہو چکے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کی مخالفین تیاری کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ ان باتوں سے ہمیں باخبر رکھتا ہے۔ مخالفت سے قطع نظر جماعت کی ترقی کے لیے بھی نئی راہیں جو اللہ تعالیٰ کھول رہا ہے اس لحاظ سے بھی بہت زیادہ خدمت کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس لیئے پہلے طبقہ پر راضی رہتے ہوئے جو امراء اور صدر صاحبان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مستقبل کی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں گے وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ دین کی خدمت سے غافل رہتے رہتے لوگ کمزور ہو جاتے ہیں اور ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ اس طرح بعض مخلصین پر طاقت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قربانی کرنے میں وہ بدمزگی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیئے نسبتاً غافل لوگوں کو بھی بیدار کرنا چاہیئے۔ اور اُن کے اُوپر بھی ذمہ داریاں ڈالنی چاہئیں۔ جماعت میں خدمت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے بلکہ یہ ایسی زمینیں ہیں جو تھوڑی سی محنت سے زرخیز بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر ان کی طرف توجہ نہ دی گئی اور انہیں صف اوّل میں لانے کی کوشش نہ کی گئی تو یہ ضائع ہو جائیں گے۔ اس لیئے امراء اور صدر صاحبان کو ابھی سے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ہمیں صفِ اوّل میں کام کرنے والوں کی تعداد کو بڑھانا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں بعض نفسیاتی روکیں بھی ہیں جن کو دُور کرنا ضروری ہے مثلاً کچھ امراء یہ سمجھتے ہیں کہ بعض احمدی ہمارے مخالف ہیں اور بعض ہمارے ساتھی ہیں۔ اور بہت سے امراء ہیں جو بدظنی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قحط الرجال ہے۔ ان کی یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن میں الرجال بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کو آگے لانے کے لیئے کوشش اور محنت کی ضرورت ہے۔ جماعتِ احمدیہ کے افراد کو اگر کوئی امیر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ قحط الرجال ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس میں عقل کا تو قحط ہو سکتا ہے لیکن جماعتِ احمدیہ میں قحط الرجال نہیں ہے۔ اگر قحط الرجالی ہوتا تو اِس وقت نعوذ باللہ جماعتِ احمدیہ پاکستان کے بہت سے لوگ مرتد ہو چکے ہوتے۔

حضور نے مزید فرمایا اِس وقت اکثر جماعتوں میں اکثر احمدی صفِ اوّل کے مجاہد نہیں۔ اس لیئے غیر معمولی کام کی ضرورت ہے۔ اگر سب صفِ اوّل میں آجائیں تو جماعت ایک بہت بڑی طاقت بن جائیگی جو پہلے سے ہی بہت بڑی طاقت ہے۔ اس لیئے سب عہدیداران پر ان کی بیداری کی ذمہ داری ہے۔ اعتماد کر کے لوگوں کو آگے لائیں اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ کام لیں۔ اس کے متعلق منصوبے بنائے جائیں۔ اگر ساری دنیا میں اس منصوبے پر عمل شروع کر دیں تو امید ہے کہ باقی تمام منصوبوں میں بھی برکت پڑ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

خلاصہ خطبہ جمعہ ۲۱ / اگست ۱۹۸۷ء

حضور نے نماز جمعہ ہالینڈ کی احمدیہ بیت الذکر "النور" میں پڑھائی۔ خطبہ جمعہ میں حضور نے اس بیت الذکر کو جلانے اور اسے نقصان پہنچانے کی شرارت کی تفصیلات بیان فرمائیں اور احباب جماعت کو اپنے حوصلے بلند رکھنے کی تلقین فرمائی۔

حضور نے فرمایا کہ چند روز پہلے ہالینڈ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کے نتیجہ میں ہالینڈ کے بعض احمدیوں نے مجھے خطوط لکھے کہ ان کے دلوں پر اس بات کا بہت اثر ہوا ہے۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ہالینڈ کے اکثر احمدی جلسہ پر لنڈن گئے ہوئے تھے۔ اس لیئے موقع پا کر بعض شریروں نے بیت الذکر کو نقصان پہنچایا جس کے نتیجہ میں قیمتی کاغذات، دستاویزات اور قیمتی اشیاء ضائع ہو گئیں۔ ظاہری نقصان کو دیکھا جائے تو یہ کافی نقصان ہے لیکن میرا آپ سب کو یہ جواب ہے کہ ایسے واقعات زندہ قوموں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اور یہ تو معمولی چیزیں ہیں۔ مگر ہمارے ارادے بہت بلند ہیں۔ ساری دنیا کی ایک سَو چودہ جماعتیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کر رہی ہیں۔ ہالینڈ کی جماعتوں میں سے ایک کو جو کانٹا چبھا ہے آپ اس پر بُرا نہ منائیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کے فضل مزید نازل ہوں گے۔ آپ کی طبیعت پژمردہ نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ کے ارادے بلند رہنے چاہئیں کیونکہ یہی مردانگی کی علامتیں ہیں۔ یہ واقعہ تو چھوٹے دل کی پیداوار ہے کہ بیت الذکر کو جلا دیا جائے۔ یہ کمینی اور سفلی حرکت ہے۔ آپ لوگوں کو تو تاریخی اعزاز حاصل ہو گیا ہے اور آپ اُن لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کے نتیجہ میں جلایا جاتا ہے۔ آپ کو اپنا یہ امتیاز ہمیشہ برقرار رکھنا چاہیئے۔

حضور نے فرمایا جب سے آدمؑ کی تخلیق ہوئی ہے

کچھ وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے گھروں کو جلاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کو خدا کی خاطر جلایا جاتا ہے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ خدا کی عبادت گاہ کو خدا کے نام پر جلایا گیا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ فائدہ ہی فائدہ میں ہیں۔ آپ کا ہرگز کوئی نقصان نہیں، میرا دھیان تو آپ کے روحانی نقصان کی طرف ہے۔

ہم اپنے مخالفین سے متعلق کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہہ سکتے جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو تب تک ہمارا اخلاقی حق نہیں بنتا کہ ہم کسی پر الزام لگائیں۔ ایسے مواقع پر اپنے اعلیٰ اصولوں کی حفاظت کرنی چاہیئے، اپنے اخلاق کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ بیوت الذکر تو صاحب ایمان اور صاحب اخلاق لوگوں کے ذریعے بنتی ہیں۔ دنیا کی قومیں کروڑوں روپوں کی بیوت الذکر بھی بنا سکتی ہیں لیکن جب تک ان میں جانے والوں کے اخلاق بہتر نہ ہوں ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

(الاعراف : ۳۲)

لہذا ظاہری بیوت الذکر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آپ اگر زینت سے بھی محروم رہ جائیں تو یہ ٹھیک نہیں۔ مخالفین خواہ جتنی بھی مخالفت کریں اس کے جواب میں آپ اپنی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حفاظت کریں اور بغیر قطعی ثبوت کے کسی پر الزام نہ لگائیں۔

ظاہری نقصان کے متعلق یہ بات ہے کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ دس گنا فضل اپنی جماعت پر فرما رہا ہے۔ چند بیوت الذکر پاکستان میں منہدم کی گئیں اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے سینکڑوں بیوت الذکر کی تعمیر کی توفیق دی۔ آپ کی بیت الذکر کو بہت عظیم الشان اور وسیع بنایا جائیگا انشاء اللہ۔ ہر تقدیر پر ہمارے خدا کی تقدیر بڑھ کر ہوگی۔

اس کی تعمیر میں اور اس سعادت میں آپ بھی ضرور حصّہ لیں۔ حضور نے فرمایا کہ ہالینڈ کی مالی حیثیت اتنی نہیں ہے لیکن یہ خطبہ دنیا میں جہاں جہاں جائیگا جماعتیں اس سعادت میں حصّہ لیں گی۔ آپ کو موجودہ عمارت سے دس گنا بڑی عمارت مہیا کی جائے گی۔ یہ ضرورت کہاں سے پوری ہوگی، مجھے اس کا فکر نہیں لیکن ایک کام میں ہالینڈ کی جماعت کو حصّہ لینا پڑے گا کیونکہ ہر طرف سے لوگ آکر کام نہیں کر سکیں گے۔ وہ یہ کہ بیوت الذکر کی تعمیر کے دَوران آپ وقار عمل کریں۔ اپنے فن اس تعمیر میں پیش کریں۔ جس کو جو ہنر آتا ہے وہ اس میں مدد کرے۔ اور اس طرح جماعت کے وقت اور جسمانی طاقت کو بروئے کار لایا جائے۔ وقت کی قربانی پیش کریں آپ کے روپے کی کمی اس سے پُوری ہو جائے گی کیونکہ خدمت کرنیوالوں کو براہ راست سعادت نصیب ہوتی ہے۔ خدا کے گھر بنانے میں مدد کرنے سے سعادت کی ایک نئی روح پیدا ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کا واقعہ ہمارے سامنے ہے کہ باپ بھی نبی اور بیٹا بھی نبی خدا تعالیٰ کو ان دونوں کا یہ فعل اتنا پیارا لگا کہ اس واقعہ کو نہ صرف ہمیشہ کے لیے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا بلکہ سب لوگ ان پر درود بھی بھیجتے ہیں لہذا آپ بھی خدا کا گھر سمجھ کر حصّہ لیں۔ یہ وہ عظیم خدمت ہے جس کو خدا پیار سے دیکھتا ہے۔ مخالفین کو یہ بتا دیں کہ ہم ہارنے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم الشان زندگی پر قائم رکھے اور اللہ ہمیں مرد صادق کی طرح زندہ رکھے (آمین)

اسیرانِ راہِ مولیٰ کیلئے خصوصی درخواستِ دعا

پاکستان کے مختلف شہروں میں متعدد احمدی اسیرانِ راہِ مولیٰ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ یہ تمام افراد، احبابِ جماعت احمدیہ کی خصوصی دعاؤں کے مستحق ہیں۔ احباب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ایسے سب احباب کی مخلصی اور نجات کی تدبیروں کو کامیاب کرے اور ان سب احباب کو استقامت کے ساتھ قربانی پیش کرنے کی توفیق دے اور اپنی جناب سے ان قربانیوں کو قبول کر کے اِن تمام احباب کو اپنے بے پناہ فضلوں سے نوازتا چلا جائے۔

چند احباب یہ ہیں سکھر کے محترم پروفیسر ناصر احمد صاحب قریشی، محترم رفیع احمد صاحب قریشی۔ ساہیوال کے مکرم رانا نعیم الدین صاحب، مکرم محمد الیاس منیر صاحب مربی سلسلہ، مکرم ملک محمد دین صاحب، مکرم محمد حاذق صاحب، مکرم عبد القدیر صاحب، مکرم نثار صاحب۔

نیز کوئٹہ کے مکرم عبد الرحمٰن خان صاحب، مکرم عبد الماجد خان صاحب، مکرم ظہور الدین صاحب بابر، مکرم رفیع احمد صاحب فاروقی۔ اور خوشاب کے مکرم ملک محمد جہانگیر جوئیہ صاحب ایڈووکیٹ اور متعدد دوسرے احباب جن کے ناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ یہ سب اسیران راہِ مولیٰ احبابِ جماعت کی خاص الخاص دعاؤں کے حقدار ہیں۔

حضرت امام جماعت احمدیہ کا ارشاد
اسیرانِ راہِ مولیٰ کے بارے میں!

سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب امام جماعتِ احمدیہ نے ۱۹ / جون ۱۹۸۷ء کے خطبہ جمعہ میں اسیرانِ راہِ مولیٰ کا خصوصی ذکر فرمایا۔ ان مجاہدین کے بارے میں حضور نے خصوصی دعاؤں کی تحریک فرمائی۔ حضور نے فرمایا:۔

"ان کو دعاؤں میں یاد رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ان کے ذکر کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ اپنی محافل میں بھی، اپنے دیگر مشاغل میں بھی۔ ذکر کے ذریعے بھی ان کو زندہ رکھیں اور دعاؤں کے ذریعے بھی ان کی مدد کرتے رہیں کیونکہ وہ ہم سب کا فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ ہم سب کا بوجھ اُٹھا رہے ہیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے اور ان کی مشکلات کو جلد تر دُور فرمائے۔"

بشارات

غموں کا ایک دن اور چار شادی

حضرت امام جماعت احمدیہ نے ۱۴؍ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ہالینڈ کی ایک مجلس عرفان میں فرمایا:-

"میرے یہاں آنے سے تین چار دن پہلے کی بات ہے مَیں نے ایک رؤیا دیکھی جو اس مفہوم میں منفرد تھی کہ مَیں نے رؤیا میں چار آدمی دیکھے اور بیداری کے بعد مجھے احساس تھا کہ ان چاروں کے نام بشیر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خاتون بھی دیکھی جو شادی شدہ ہیں اور ان کا نام بشریٰ نہیں ہے اور خواب میں مجھے یہ علم بھی ہے لیکن پھر بھی مَیں خواب میں ان کا نام بشریٰ ہی سمجھتا ہوں۔ خواب میں جب مَیں اس خاتون کو بشریٰ کے نام سے بلاتا ہوں تو مجھے یہ احساس بھی ہے کہ یہ کسی بشیر نامی شخص کی بیٹی نہیں لیکن ساتھ ہی مَیں اسے بشیر نامی شخص کی بیٹی بھی سمجھتا ہوں اور وہ پانچواں بشیر ہے۔ رؤیا میں مجھے اپنے خیالات پر کنٹرول حاصل نہیں۔ مَیں اس خاتون کو بشریٰ کے نام سے بلاتا ہوں اور اُسے بشیر نامی شخص کی بیٹی سمجھتا ہوں۔ جبکہ اس کے والد کو مَیں جانتا ہوں کہ اس کا نام یوسف ہے۔ بشیر نہیں۔

رؤیا میں سب سے پہلے بشیر نامی شخص جو مجھے ملتے ہیں وہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ..... ہیں۔ وہ مجھے بہت احترام سے ملتے ہیں اور مَیں بڑا اچنبھا محسوس کرتا ہوں کیونکہ ان کی حینِ حیات ان کی ساری زندگی میں میرے دل میں ان کے لیئے دوسرے ہر احمدی کی طرح بڑا احترام تھا۔ اور چونکہ مَیں اُن کا بھتیجا بھی تھا اس لیئے میرے دل میں احترام اور محبت کا جذبہ اَور بھی بڑھ کر تھا۔ لیکن جب وہ مجھے خواب میں ملتے ہیں تو وہ میرے (امام) ہونے کی وجہ سے مجھ سے اس قدر احترام اور تابعداری کا اظہار فرماتے ہیں کہ مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور مَیں سوچتا ہوں کہ مَیں ان کے اس احترام اور عزت افزائی کا سامنا کس طرح کروں۔ لیکن پھر مَیں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ مجھے (امام) بنایا ہے اس لیئے مجھے اس صورتِ حال کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔

اس کے بعد مجھے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ..... کا خادم ملتا ہے۔ اس کا نام بھی بشیر ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں میرے لیئے دودھ کی ایک بوتل ہے۔ ان کے علاوہ ایک اَور بشیر نامی نوجوان ہے جو میرے پاس رہا ہے۔ اسکے والد وفات پا گئے تھے یا غالباً احمدیت چھوڑ گئے تھے۔ تو اس کے دادا نے اُسے میرے پاس بھجوایا تھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ وہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ..... کے خادم بشیر سے دودھ کی وہ بوتل پکڑ لے

اس کے بعد میری ایک دیرینہ زیرِ علاج خاتون جن کے متعلق مَیں جانتا ہوں کہ ان کا نام بشریٰ نہیں ہے

اور نہ ان کے والد کا نام بشیر ہے۔ لیکن خواب میں میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا نام بشریٰ ہے اور اس کے والد کا نام بشیر ہے۔

جب میں بیدار ہوا تو اس خواب کا اثر انتہائی حیران کن تھا۔ خواب میں چار بشیر دیکھنا بلکہ پانچواں بشیر بھی جو والد تھا۔ فوری طور پر حضرت (بانیٔ سلسلہ احمدیہ) کا یہ شعر میری زبان پر آیا ؎

غموں کا ایک دن اور چار شادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

کہ مجھے وعدہ دیا گیا ہے کہ غم کا ایک اور بشارات اور خوشیوں کے چار دن ہوں گے۔ اور پاک ہے وہ اللہ جس نے میرے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

بیداری کے بعد یہ پہلی تفہیم تھی جو میرے ذہن میں آئی اور میں سمجھ گیا کہ کیا مراد ہے۔"

بقیہ حضرت امام حسینؓ از صفحہ

جلا دیا۔

خولی بن یزید جس نے سیدنا حسینؓ کا سر کاٹنے کا ارادہ کیا تھا، مختار کے سامنے لایا گیا تو اس نے اُسے قتل کرا کے اس کی لاش جلا دی۔ عمرو بن سعد اور اس کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا گیا۔

کوفہ میں قاتلانِ حسینؓ کا کام تمام کرنے کے بعد مختار نے ابراہیم بن اشتر کو لشکر دے کر عبید اللہ ابن زیاد کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ زبردست مقابلے کے بعد ابن زیاد کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدانِ جنگ میں مارا گیا اس کے علاوہ دوسرے شامی سردار حصین بن نمیر اور شرجیل بن ذی الکلاع بھی مارے گئے۔ حصین وہ شخص تھا جس نے یزید بن معاویہ کے حکم سے بیت اللہ شریف پر منجنیقوں سے پتھر اور آگ برسائی تھی، جس سے اللہ تعالیٰ کا گھر منہدم ہو گیا تھا۔ ابراہیم بن اشتر نے ابن زیاد اور دیگر شامی سرداروں کے سر کاٹ کے فتح کی خوشخبری کے ساتھ مختار ثقفی کے پاس کوفہ بھجوائے اور ان کے سر بھی اسی دار الامارہ میں رکھے گئے، جہاں سیدنا حسینؓ اور آپ کے اقرباء و احباء کے سر رکھے گئے تھے ع حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں ٭

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۳)

عزت

ایک اجنبی بو علی سینا سے ملنے آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: "جناب والا! میں بخارا کے سب سے بڑے عالم بدر الدین کا بیٹا ہوں میرے گھر میں اتنی دولت تھی کہ دونوں وقت دستر خوان پر سو آدمی کھانا کھاتے تھے" بو علی سینا نے اس کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اپنے باپ دادا کی تعریف سے انہیں بڑا ثابت کر رہے ہو۔ تو بڑا پن اُن میں تھا، اور وہ عزت کے مستحق تھے نہ کہ تم۔ اور اگر تمہارے دستر خوان پر سو آدمی شریک طعام ہوتے تھے۔ تو یہ دولت کی خوبی تھی نہ کہ تمہاری۔ آخر تم کس خوبی کی بنا پر ہم سے عزت کرانا چاہتے ہو؟"

(شاہین منیر۔ لاہور)

پاکستانی سائنس ۱۹۸۶ء

گزشتہ برس ۲۲ر جون تا ۱۰ر جولائی نتھیا گلی میں گیارھواں بین الاقوامی سمر کالج منعقد ہوا۔ جس کا اہتمام پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن نے کیا تھا۔ اِس موقع پر پاکستان پلاننگ کا بھی اجلاس تھا۔ اِس خصوصی مشترکہ اجلاس کے یومِ افتتاح پر عالمی شہرت یافتہ سائنسدان محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے پاکستانی سائنس ۱۹۸۶ء کے عنوان سے ایک شاندار مقالہ پڑھا تھا۔ جس کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

یہ ترجمہ ماہنامہ "طالب علم" کراچی کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

تمہید

پاکستانی قوم کوئی چھوٹی قوم نہیں۔ اس ملک کی آبادی ساڑھے نو کروڑ سے بھی زیادہ ہے جو جاپان کے برابر اور فرانس اور برطانیہ سے دوگنی ہے۔

جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے پاکستانی قوم نے اُمتِ مسلمہ کی حیثیت سے ماضی میں سائنس کی ترقی و ترویج میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ جن میں کچھ مسلمان بھی شامل ہیں۔ اسلامی سائنس کے سنہری زمانے میں ریاضی، طبیعیات، حیاتیات، کیمیا اور طب میں مسلمان سائنس دانوں کے عظیم اور شاندار کارناموں کو "محض یونانی روایت کا تسلسل" کہہ کر ان کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نک چڑھے لوگ بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلمان سائنسدانوں ہی نے دنیا کو پہلی بار اس خیال سے روشناس کرایا تھا کہ سائنس اپنی ابتداء و انتہا میں ایک عملی اور تجربی علم ہے۔ بریفالٹ کی بات یاد آ رہی ہے۔ اُس نے کہا تھا: "اہلِ

یونان نے ضابطہ بندی کی، عام اصول وضع کیئے، اور نظریے بنائے۔ مفصل اور طویل مشاہدے اور عملی وتجرباتی تحقیق کے صبر آزما مراحل کو طے کرنا یونانی مزاج کے یکسر خلاف تھا جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ مشاہدے، تجربے اور پیمائش کے اُن نئے نئے طریقوں سے پیدا ہوئی جو یورپ میں مسلمانوں نے متعارف کرائے تھے۔ جدید سائنس، اسلامی تہذیب کا انتہائی اہم اور مہتم بالشان کارنامہ ہے۔" بریفالٹ کی اس رائے کی تصدیق سائنس کے عظیم مورخ جارج سارٹن نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ازمنہ وسطی کا اہم ترین کارنامہ تجرباتی اسپرٹ کی تخلیق تھا۔ اور یہ بنیادی طور پر مسلمانوں نے پیدا کیا تھا اور بارھویں صدی تک جاری وساری رکھا۔ تجرباتی علم ومہارت پر اصرار کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں، اور بالخصوص پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے روایتی کاریگری اور ہنرمندی میں ہمیشہ درجۂ کمال حاصل کیا تھا۔

بدقسمتی سے سائنسی علوم میں ہمارا حال شاندار تو کیا انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ اس وقت کرۂ ارض پر جتنی بھی تہذیبیں موجود ہیں، سائنس اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ کمزور ہے، جن میں اپنا پاکستان بھی شامل ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ برعظیم پاک وہند میں مسلمان قوم کسی بھی دور میں سائنسی علوم میں پُر مایہ نہیں تھی۔ ہم اپنی تاریخ کے افغان اور مغل ادوار میں کسی ایک بھی بڑے سائنسدان کا نام نہیں لے سکتے (سوائے البیرونی کے، جو ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ ہندوستان آیا تھا)۔ ہمارے حکمرانوں اور ان کی فوجی حکومتوں کو علمی ادارے یا سائنس اکیڈمی اور یونیورسٹیاں قائم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی انہیں اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اپنے مقبرے تعمیر کرانے سے دلچسپی تھی، جو اُن کی عظیم الشان سلطنتوں کی یادگاریں کہلائیں۔ افسوس صد افسوس، اُنکی چھوڑی ہوئی یہ روایت اب تک کسی نہ کسی طور جاری ہے۔

پاکستانی سائنس کی حالت خراب کیوں ہے؟

میرے خیال میں تین چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت خراب خستہ ہے۔

(الف) سائنسی علم کے حصول وترقی کے لیئے کوئی قومی پیمان نہیں ہے، کوئی اجتماعی احساس نہیں ہے کہ قوم کے اقتصادی اور دیگر مسائل حل کرنے کے لیئے سائنس کے عملی اطلاق سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، جیسا کہ مثلاً جاپان میں شہنشاہ میجی کے دور میں ہوا تھا۔ شہنشاہ نے جاپان کے نئے آئین کی جزو کی حیثیت سے پانچ حلف اُٹھائے تھے جن میں سے ایک یہ تھا:

"جاپان کی عظمت وجلالت کی خاطر پوری صلاحیت واستطاعت سے علم حاصل کیا جائے گا، خواہ وہ کہیں سے بھی حاصل ہو۔"

قومی عزم وپیمان کے نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں عملی اور فعال سائنس دانوں کا قحط الرجال ہے اور صورتِ حال اچھی ہونے کی بجائے سال بہ سال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔

(ب) ہمارے ملکوں میں کارگہ سائنس کا نظام

نوجوان، پُرجوش، فعال اور عملی سائنس دانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، جیساکہ دوسرے بڑے مُلکوں کی یہ عام روایت ہے۔ چند مستثنیات سے قطع نظر ہماری یونیورسٹیوں میں سائنس کا تخلیقی سرچشمہ خشک پڑا ہے۔ یونیورسٹیوں سے باہر پاکستان کاغذی قسم کی تحقیقی تنظیموں کی حقیقی جنت ہے، جن میں زندہ رہنے کی سکت نہیں، اور اگر ہو بھی تو ان کے درمیان، رابطے کا کوئی مؤثر نظام نہیں۔

(ج) ٹکنالوجی میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں سے ایک نے بھی خود اعتمادی حتیٰ کہ دفاعی ٹکنالوجی میں بھی عظمت پیدا کرنے کو قومی مقصد قرار نہیں دیا۔ ہم نے ٹکنالوجی کی سائنسی بنیاد پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کو لعن طعن کرنے سے پہلے کہ اُس نے فارمیسی کی کیمیا میں تحقیق کیوں نہیں کی، یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ گزشتہ چالیس سال میں ہماری پے بہ پے آنے والی حکومتوں نے گویا یہ طے کر رکھا تھا کہ ہمیں درآمدی کیمیات سے گولیاں بنانے اور پیک کرنے کے سوا اور نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ ملکی کارخانوں میں اسپرین یا وٹامن وغیرہ بنانے کی صنعت شروع بھی ہوئی، تو مناسب تحفظات نہ ہونے کے باعث بند ہو گئی۔ پی سی ایس آئی آر کو حقیقی معنوں میں کوئی موقع ملا بھی تو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران، جبکہ جنگی کیمیات کی درآمد فوراً رُک گئی کونسل سے وابستہ کیمیا دانوں نے اس چیلنج کو مردانہ وار اور کامیابی کے ساتھ قبول کیا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ جنگ کے بعد بھی یہ تمام کیمیات ہم خود پاکستان میں بنایا کریں گے اور درآمد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے چند ماہ بعد ہی درآمد کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

اب مَیں اِن تین نکات کی تشریح کروں گا:۔

(الف) **قومی عزم و پیمان کا فقدان**۔ پاکستان کی کوئی واضح خارجہ پالیسی ہو گی۔ درآمدی برآمدی پالیسی بھی ممکن ہے کہ واضح ہو۔ دفاع کی پالیسی بھی شاید واضح ہو، لیکن سائنس یا ٹکنالوجی کی قطعاً کوئی پالیسی نہیں ہے، اور اگر ہے تو اب تک اس کا اعلان نہیں کیا گیا۔ پچھلے نیشنل کمیشن کی رپورٹ میں ۱۹۵۹ء میں اس کا محض حوالہ دیکھنے میں آیا تھا۔

اس معاملے کا ایک پہلو یہ ہے کہ سائنسی علوم کی سرپرستی کے لیئے سرکاری یا نجی سطح پر کسی قسم کا کوئی قومی عزم و پیمان نہیں ہے۔ ذہین و فطین دانشوروں کو سائنس اور سائنسی پیشوں کی طرف لانے کی کوئی ترغیب، کوئی پالیسی نہیں ہے۔ ہم سائنس کی ترقی حتیٰ کہ دفاعی سائنس کو بھی کوئی ترجیح نہیں دیتے، حالانکہ میرے ذاتی خیال میں سائنس کو اُتنی ہی ترجیح دینی چاہیئے جتنی دفاع کو دی جاتی ہے۔ قومی زرعی کونسل یا سپارکو یا ایٹمی انرجی کمیشن جیسے اداروں میں جو تھوڑی بہت سائنس اور ٹکنالوجی ہمیں نظر آتی ہے یا جس کا چرچا ہوتا رہتا ہے، وہ افراد کی ذاتی اور انفرادی کوششوں کا ماحصل ہے۔

حوصلہ افزائی اور سرپرستی سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس کی مثال دیکھنی ہو تو آیئے روس کی اکیڈمی آف سائنسز کی تاریخ اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ یہ اکیڈمی

پیٹر اعظم نے قائم کی تھی۔ چالیس سال پہلے اکیڈمی سے کہا گیا کہ وہ اپنے ارکان کی تعداد بڑھائے اور تمام سائنسی علوم کی یکساں ترقی کا خصوصی پروگرام بنائے۔

آج اکیڈمی ڈھائی لاکھ سائنس دانوں پر مشتمل ایک خود مختار مقتدرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ڈھائی لاکھ سائنس دان مختلف اداروں اور شعبوں میں تحقیقی و عملی کام کر رہے ہیں، اور ان کو روس جیسے سخت گیرانہ نظام میں بھی ایسی ترجیحات اور مراعات حاصل ہیں کہ دوسرے ملکوں کے سائنس دان اُن پر رشک کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے ایک معزز رکن مسٹر مالکیو کے خیال میں، یہ ذہنی انقلاب ۱۹۴۵ء میں آیا تھا، جبکہ روس کی اقتصادیات جنگِ عظیم کے باعث تباہ ہو چکی تھی۔

اسٹالن نے فیصلہ کیا کہ وزن ان ذہین جوان مردوں اور عورتوں پر ڈالا جائے جو سائنسی علوم سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ اُن کی زیادہ سے زیادہ بھرتی کا فیصلہ کیا گیا۔ افسر شاہی نے اِس فیصلے کی مخالفت کی، لیکن اسٹالن نے اُن کے ماہرانہ مشوروں کی پروا کیے بغیر ایک روز سرکاری طور پر اعلان کر دیا کہ اکیڈمی سے وابستہ تمام سائنسدانوں کی تنخواہ میں تین سو فیصد کا اضافہ کیا جا رہا ہے ـــــ بقول مسٹر مالکیو "ڈاکٹروں یا انجینئروں کی تنخواہ میں نہیں، صرف سائنس دانوں کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا۔" اُس وقت سے لیکر آج تک روسی سائنس کو کچھ اور مسائل کا سامنا ہو تو ہو، لیکن حوصلہ افزائی اور سرپرستی کا فقدان اُن کا مسئلہ نہیں ہے۔

یہ بات مشرقی یورپ کے ملکوں پر بھی صادق آتی ہے۔ وہاں سائنس کے احترام کو مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ حال ہی میں صوفیہ گیا تھا، وہاں میں نے شہر کے عین قلب میں، ایک بڑے چوک میں اکیڈمی آف سائنسز کی عالیشان عمارت کا پُر وقار منظر دیکھا۔ ملک کے بیشتر تحقیقی سائنسی ادارے اکیڈمی کے ماتحت ہیں۔ یہ اکیڈمی تقریباً ۱۲۵ سال پہلے بلغاریہ کے جلاوطن سائنسدانوں نے اُس وقت قائم کی تھی، جب بلغاریہ ابھی سلطنتِ ترکیہ کا ایک حصّہ تھا اور ابھی اسے آزادی و خود مختاری حاصل نہ ہوئی تھی۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستانی سائنس اپنی تعداد و مقدار کے اعتبار سے بھی چھوٹی، بہت چھوٹی ہے۔ مجاہد کامران صاحب نے رسالہ "کونسپٹ" میں لکھا ہے کہ "پاکستان کی یونیورسٹی میں طبیعیات پڑھانے والے اساتذہ کی کُل تعداد ۸۶ ہے، جن میں سے صرف ۴۶ پی ایچ ڈی ہیں۔"

مجاہد کامران صاحب مزید لکھتے ہیں: "پلازما طبیعیات کے شعبے میں انڈیا کے پاس ۱۵۰ سائنسدان ہیں جبکہ پاکستان کے پاس فقط تین ہیں۔ لیزر طبیعیات میں ورک رکھنے والے سائنسدانوں کی تعداد پاکستان میں پندرہ، انڈیا میں دو سَو سے زائد اور چین میں دو ہزار سے زائد ہے۔ انڈیا میں سائنسدانوں کی تعداد پاکستان سے اسّی گنا زیادہ ہے، جبکہ انڈیا کی آبادی پاکستان سے صرف آٹھ گنا زیادہ ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد سے تو، جب سے پاکستانی ذہانت مشرقِ وسطیٰ میں منتقل ہونا شروع ہوئی ہے، اِس تعداد میں تیزی سے کمی آ رہی ہے۔ پروفیسر مائیکل موراوسکک کے اندازے کے مطابق "پاکستان تیسری دُنیا کے اُن چند ملکوں میں شامل ہے، جہاں تحقیقی اشاعت تیزی سے

گھٹ رہی ہے، جبکہ دوسرے زیر ترقی ممالک میں اوسطاً ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے"۔

ایک اشارہ کافی ہے۔ انڈیا میں، جس کی آبادی پاکستان سے آٹھ گنا زیادہ ہے، سالانہ وہاں کی یونیورسٹیوں میں طبیعیات میں ۲۰۰ پی ایچ ڈی والے سائنس دان پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا موازنہ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے کیجئے۔ لاہور کی پنجاب کی یونیورسٹی نے اپنی سو سال کی عمر میں ریاضی میں ایک بھی پی ایچ ڈی پیدا نہیں کیا، اور طبیعیات میں بھی فقط تین ڈاکٹر سائنسدان پیدا کیے ہیں۔

مجاہد کامران صاحب نے اس قحط الرجال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ سیاسی (اور فوجی) قیادت قوم کی تعمیر میں سائنس کے کردار کا اندازہ کرنے سے قاصر رہی۔ دوسری وجہ ہماری افسر شاہی کی تنگ دلی اور پست ذہنیت ہے ...... اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر زیادہ تر ایسے لوگوں کا تسلط ہے، جن کو تعلیم (سائنس) سے کوئی دلچسپی نہیں .... جن کی اپنی علمی سطح بس اوسط درجے کی ہے ..... جن میں تحیّر و تجسس کا جذبہ نہیں، تحقیق کی امنگ نہیں، نئے نئے خیالات کی روح پرور ولولہ انگیزی نہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ نظم و نسق کے ڈھانچے میں جس طرح کے انتظامی محکمے اور ہیں، ویسا ہی تعلیم (سائنس) کا محکمہ ہے۔ ایک معمولی، غیر اہم سا محکمہ"۔

سائنس دانوں کے لیے افسرانِ بالا کے دل میں جو نفرت و حقارت بیٹھی ہوئی ہے، اس کا ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں۔ مجھے پاکستان کے پلاننگ کمیشن کا ایک سابق چیئرمین یاد آتا ہے۔ میں نے اُن سے سائنسدانوں کے رہائشی مسئلے کو حل کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا: "آدھا کراچی فٹ پاتھ پر سوتا ہے، سائنسدان فٹ پاتھ پر کیوں نہیں سو سکتے؟" اور جب میں نے اُن کی خدمت میں گزارش کی کہ سائنس پر مبنی صنعتوں کی منصوبہ بندی کرتے وقت سائنسدانوں سے مشورہ کر لیجئے گا تو انہوں نے تنک مزاجی سے کہا: "مجھے سائنسدانوں سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنا گھر چلانے کے لیے اپنے باورچی سے مشورہ نہیں لیا کرتا"۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے کون سے قدرتی حق کی بناء پر پلاننگ کمیشن کے سربراہ بنے بیٹھے تھے۔

(ب) کارگہ سائنس کا نظام۔ سائنس اپنی ترقی اور پیش رفت کے لیے بلند پرواز اونچی شخصیتوں کی محتاج ہے۔ ایسے حالات پیدا کیے جانے چاہئیں کہ ایسے لوگ ملک سے باہر نہ جانے پائیں، بلکہ ملک کے اندر ہی رہ کر اس کی خدمت کرتے رہیں۔ کارگہ سائنس کا نظام خود سائنس دانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ اسرائیل کے سائنسدان آنجہانی امیوس ڈی شلیط سے (اُس وقت وہ وائزمین انسٹی ٹیوٹ یروشلم کے ڈائرکٹر تھے) اقوام متحدہ کی ایک کمیٹی میں برسرِ اجلاس یہ پوچھا گیا کہ اسرائیل کی سائنس پالیسی کیا ہے؟، تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا: "ہماری سائنس پالیسی بہت سادہ ہے۔ اس کے صرف دو اصول ہیں۔ اوّل یہ کہ ایک عملی سائنس دان کبھی غلط نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اور وہ جتنا کم عمر اور نوجوان ہوگا اتنا ہی زیادہ صحیح ہوگا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے وابستہ سائنسدانوں

کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جب چاہیں، جہاں چاہیں، چلے جائیں۔ اُن کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اپنی تحقیق کی خاطر ملک سے باہر بھی (عارضی طور پر) جا سکتے ہیں۔ باہر جانے کی صورت میں صرف ایک شرط عائد کی جاتی ہے کہ وہ اسرائیلی لڑکی سے شادی کر کے جائے۔ تاکہ واپسی کا راستہ کھلا رہے۔"

اہلِ پاکستان کے لیئے اِس میں درسِ عبرت پنہاں ہے۔

اب میں پھر اپنی گفتگو کی طرف آتا ہوں۔ پہلے اپنی یونیورسٹیوں کا حال دیکھیئے۔

(ل) ہماری جامعات کو سارا زور تحقیق پر ڈالنا چاہیئے۔ ہمیں اِس اصول کا احترام کرنا چاہیئے کہ یونیورسٹی کے استاد کا آدھا وقت تحقیق پر اور آدھا وقت تدریس پر صرف ہونا چاہیئے۔ فی الحال ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہمارے قومی تحقیقی ادارے اطلاقی مضامین کے لیئے یونیورسٹی سے استمداد نہیں کرتے۔ اِس طریقے سے ہمارے نوجوان طلباء اداروں کے بڑے سائنسدانوں کے علم اور تجربے سے مستفید نہیں ہو پاتے ہمیں یہ طریقہ فوراً ترک کر دینا چاہیئے۔

(ب) پاکستانی جامعات میں مسلسل ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں، مسلح گروہوں میں لڑائیاں ہوتی ہیں، اکثر قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک ہے۔ یقین نہیں آتا کہ مارشل لاء کی حکمرانی بھی ان طلباء کو، جو سکون و اطمینان سے پڑھنا چاہتے ہیں، حقِ مطالعہ کی ضمانت نہیں دے سکی، جبکہ ایسے طلباء میں اکثریت سائنس کے طلباء کی ہوتی ہے۔ حقِ مطالعہ کی ضمانت دینا ہر حکومت پر واجب ہے۔

(ج) پاکستانی سائنس کو بین الاقوامی سائنس سے ایک زندہ تعلق اور ربط ضبط رکھنا چاہیئے۔ آج ملک میں کام کرنے والے سائنس داں بہت کم ایسے ہیں کہ بیرونی ممالک کے سائنسی اداروں میں جائیں، اور اُن سے بالمشافہ مکالمہ کریں۔ اِس نوعیت کے علمی سفر کو پُرتعیش ضیاع خیال کیا جاتا ہے۔ اِس علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے کے لیئے ہی میں نے "بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبیعیات" قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ تاکہ زیرِ ترقی ممالک کے طبیعیات داں اپنے مضمون میں تازہ ترین تحقیقات سے مستفید ہونے کے لیئے جلا وطنی کی زندگی بسر نہ کریں۔ یہ مرکز اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں اقوامِ متحدہ کی دو ایجنسیوں یعنی بین الاقوامی ایٹمی انرجی ایجنسی اور یونیسکو کے باہمی اشتراک سے کام کر رہا ہے۔ صرف ایک سال ۱۹۸۵ء میں (اٹلی یا سویڈن کی مالی اعانت سے) ۵۷ پاکستانی طبیعیات دانوں نے مرکز میں آکر تحقیقی سہولتوں سے فائدہ اُٹھایا۔

(د) ہم نے سائنس داں کو صرف انفرادی طور پر ہی تنہا نہیں کر دیا، بلکہ بقول مسٹر زہلان: "ہم نے بین الاقوامی سائنس کے عام معیاروں سے بھی قطع تعلق کر لیا ہے۔ مغرب یا روس میں سائنس کا نظام خود مختاری کی بنیاد پر چلتا ہے، ہمارا انداز جُدا ہے۔ ہمارے ہاں تو پیشہ ورانہ تنظیموں کا بھی کوئی نظام پیدا نہیں ہو سکا۔ تبصرے و تجزیے کے لیئے مجلسیں برپا نہیں ہوتیں، معیار کی کیفیت کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کا آزادانہ انتظام نہیں علمی جلسے منعقد نہیں ہوتے، سائنس فاؤنڈیشنیں نہیں، جو سائنس دانوں کے ہاتھ میں فعال طریقے سے

چل رہی ہوں، گرانٹ اور مالی امداد کے آزاد سرچشمے نہیں! پیشہ ورانہ تنظیموں کے فقدان کا الزام خود سائنس دانوں کے سر ہے۔ انہوں نے کبھی سر جوڑ کر بیٹھنے اور متحد ہونے کی کوشش نہیں کی۔

(ھ) ایک اور اہم بات جس سے تحقیق پر بُرا اثر پڑتا ہے، مجاہد کامران کے لفظوں میں "یہ ہے کہ تعلیمی اداروں اور تحقیقی تنظیموں کا سربراہ نا اہل لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے قطع نظر ایک بھی اچھا اور بڑا ریسرچ اسکالر ایسا نظر نہیں آتا جسے ہماری جامعات کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر کا کیریئر تھرڈ کلاس رہا ہے۔ اور اگر انہوں نے کبھی تحقیقی کام کیا بھی تھا، تو اُس وقت جب وہ خود طالب علم تھے۔ اداروں کے اس قسم کے سربراہوں نے تدریس و تالیف و تحقیق کو ایک معزز پیشہ بنانے کی تدبیریں کرنے کی بجائے اپنی پوری صلاحیتیں اس کے اُلٹ ثابت کرنے میں صرف کر دی ہیں —— اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ذہین و فطین افراد یا تو ملک چھوڑ کر بیرونی ممالک میں چلے گئے ہیں یا شدید اعصابی اذیت اور ذہنی کوفت نے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اس لیے اگر وائس چانسلروں کے خلاف غیظ و غضب پایا جاتا ہے تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔"

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً ہر یونیورسٹی میں وائس چانسلر اور اساتذہ کے درمیان تخریبی نوعیت کی آویزش پائی جاتی ہے، جو اساتذہ کی تدریسی صلاحیت کو زنگ لگا دیتی ہے، علمی ماحول خراب کر دیتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قحط الرجال کا سبب بن جاتی ہے۔

اس سیاق و سباق میں اوریگون یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر مائیکل موراوسکک کی رائے کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "علاوہ ازیں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی سائنس پالیسی بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس امر کا احساس ہی نہیں ہے کہ کوئی مسئلہ ہے، جب احساس ہی نہیں تو اعتراف کی کیا حقیقت۔ میں دیکھتا ہوں کہ آج پاکستان میں سائنس کا نظم و نسق بہت کمزور ہے۔ معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو امورِ سائنس سے نمٹنے کا ذاتی تجربہ نہیں۔ جن کو یہ ادراک حاصل نہیں کہ ایک ملک کی ترقی میں سائنس کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ جن کو نہ بصیرت حاصل ہے نہ تخیل۔"

پروفیسر مائیکل نے حال ہی میں مجھے ایک خط بھیجا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صدرِ پاکستان سے اُن کی کئی برس سے مکاتبت چل رہی ہے۔ اُنہوں نے صدر صاحب کو لکھا ہے کہ پاکستان کی جامعات سے کوئی نیا علم تخلیق نہیں ہو رہا اور نہ وہ اپنے طلباء و طالبات میں نیا علم منتقل کر رہی ہیں۔ چنانچہ پاکستانی سائنس شدید خطرے میں ہے۔ پروفیسر صاحب نے صدرِ مملکت کو تین امور کی نشاندہی کرائی ہے۔ وہ صدر صاحب کے نام یوں لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے اس مقالے کی کاپی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، جو میں نے اسلامی سائنس کے موضوع پر اسلام آباد

کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اگرچہ میرے اپنے مقالے کا موضوع یہ نہیں تھا، تاہم اس فراہم کردہ معلومات کی مدد سے پاکستانی سائنس کا موازنہ دوسرے ملکوں کی سائنس سے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی معلومات خاکہ نمبر۱ اور نمبر۲ میں درج ہیں۔ میں نے آپ کی سہولت کی خاطر آپ کی کاپی میں سُرخ نشان لگا دیا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیئے ماہر ریاضی داں ہونا ضروری نہیں کہ بیشتر ممالک کے خطوط اوسط سے اُوپر کی طرف گئے ہیں اور ۴۰ فی صد اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے جبکہ اسی مُدّت میں پاکستان کے خطوط اوسط سے نیچے گر گئے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سائنسی مصنفین کی تعداد ہی کسی ملک کی سائنسی سرگرمی کا واحد اشارہ ہے لیکن جب ہم اُوپر جاتے ہوئے اور نیچے گرتے ہوئے خطوط کو دیکھتے ہیں تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔

دوسرا اشارہ زیادہ شماریاتی نہیں ہے۔ میں "فزکس انٹرویو پروجیکٹ" کا خالق ہوں اور اس پروجیکٹ سے شروع ہی سے میرا رابطہ برابر قائم ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت ایشیا کے اُن طلباء کی ذہانت کا مطالعہ و موازنہ کیا جاتا ہے جو امریکا میں طبیعیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیئے مالی امداد کی درخواست کرتے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے افسر ایشیائی ممالک میں جا کر طلباء سے بہ نفسِ نفیس انٹرویو کرتے ہیں اور ہر طالب علم کے لیئے یک صفحاتی تشخیص نامہ تیار کرتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں اس پروجیکٹ کے تحت پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، سنگاپور، انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، فلپائن، ہانگ کانگ اور جنوبی ایریا کے ۱۷۰ طلباء کے انٹرویو لیئے گئے۔ طلباء کی ذہانت و معیار کو جانچنے کے لیئے ہر ملک میں ایک جداگانہ پیمانہ مقرر کیا گیا، جس کے مطابق ان گیارہ ملکوں کی درجہ بندی کی گئی۔ ان گیارہ ملکوں میں پاکستان نویں نمبر پر نکلا۔

تیسرا اشارہ اگرچہ زیادہ داخلی ہے، لیکن افادیت کے لحاظ سے کم نہیں۔ پاکستان کی سائنسی افرادی قوّت کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس پر بوڑھوں کا قبضہ ہے۔ جب ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ پاکستانی سائنس سے میرا رابطہ قائم ہوا تھا تو سائنسی علوم میں بہت سے روشن خیال، ذہین و فطین نوجوان کام کر رہے تھے، بہت سے ابھی اعلیٰ سطحوں پر تعلیم حاصل کر رہے تھے، لیکن غضب کی صلاحیت ظاہر کرتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی شاندار کارنامہ کر دکھائیں گے۔ اُن میں سے بہت سوں نے آنے والے برسوں میں سائنس کی نمایاں خدمات بھی کیں لیکن اب اُس نسل کے لوگ

چالیس کے پیٹے میں ہیں۔ اُن سے زرخیزی اور تخلیق کی بُو اب تک آرہی ہے، لیکن یہ نسل مجموعی طور پر تحقیق کے باب میں برابر کمزور پڑ رہی ہے، غالباً معاشرے کے چلن سے تھک گئی ہے، غالباً انتظامیہ کے رویّے نے مایوس کر دیا ہے۔ تکلیف کی بات یہ ہے کہ سائنس دانوں کی نئی نسل اِس پُرانی نسل کی جگہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اِس سے نہ صرف یہ کہ حال گہنا گیا ہے، بلکہ مستقبل کے بارے میں بھی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ تاریک ہے۔"

(ج) ٹکنالوجی میں خود اعتمادی:

پاکستان میں سائنس و ٹکنالوجی کی خرابی کا تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ٹکنالوجی کی کوئی واضح پالیسی موجود نہیں ہے، اور اِس امر کا بھی احساس موجود نہیں ہے کہ سائنس کی منتقلی ہونی چاہیئے۔ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہم تو ٹکنالوجی کی منتقلی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، حالانکہ اس کا مطلب فقط اتنا ہوتا ہے کہ ہم مشینیں، ڈیزائن، کاریگر، انجنیئر اور بعض صورتوں میں قدرے صاف شدہ خام مواد درآمد کرتے ہیں۔ ٹکنالوجی کی ایسی منتقلی کی بے اثری کو پروفیسر سی جی اولڈہام نے ایک مثال سے واضح کیا ہے۔ پروفیسر اولڈہام سسکس یونیورسٹی کے "سائنس پالیسی ریسرچ یونٹ" کے بانی ہیں، جس نے عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ پروفیسر ۱۹۶۳ء میں ہانگ کانگ میں ارضی طبیعیات داں کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام سائنس و ٹکنالوجی کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جنیوا آئے۔ کانفرنس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "سائنس پالیسی ریسرچ یونٹ" قائم کر ڈالا۔ ہانگ کانگ واپس جاتے ہوئے حکومتِ اسرائیل نے انہیں ایک دو روز تل ابیب میں قیام کرنے کی دعوت دی۔ اسرائیل میں قیام سے اُنہیں اُس خلیج کا احساس ہُوا جس نے ہانگ کانگ اور اسرائیل کی دو مملکتوں کو ایک دوسرے سے معنوی لحاظ سے ممیز کر رکھا ہے۔ دونوں ملکوں کی آبادی پناہ گیروں پر مشتمل ہے۔ آبادی اور وسائل کے لحاظ سے تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن ایک ملک میں زیادہ زور ٹکنالوجی پر دیا گیا ہے۔ (ہانگ کانگ)۔ جبکہ دوسرے ملک میں ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی سائنس پر بھی تکیہ کیا گیا ہے۔ (اسرائیل)۔ ان میں سے اسرائیل ایک طاقتور ملک بن کر اُبھرا ہے، جبکہ ہانگ کانگ ابھی ترقی پذیر ہے۔"

میرا خیال ہے کہ پروفیسر اولڈہام نے بعض دوسرے عوامل کو پیشِ نظر نہیں رکھا جو اسرائیل کیلئے مددگار ثابت ہوئے اور ہانگ کانگ کے خلاف گئے۔ البتہ وہ اِس امر کی نشاندہی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ "ٹکنالوجی بغیر سائنس" اور "ٹکنالوجی مع سائنس" کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

سفارشات

لیکن اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ سائنس کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے لیئے بھی زیادہ سے زیادہ نسل دو نسل کی ضرورت پڑتی ہے، جیسا کہ امریکا، روس، جاپان اور اب برازیل، انڈیا، چین اور کچھ عرصے سے کوریا کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ پاکستانی سائنس

کی ترقی کے لئے چند سفارشات پیشِ خدمت ہیں :-

۱۔ ہمیں ضرورت ہے ایسی پالیسی کی جس کے تحت اعلیٰ درجے کی سائنس ترویج پائے اور قومی مسائل پر اس کا اطلاق کیا جائے، نیز اس قومی عزم و پیمان کا اعلان کیا جائے کہ سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی میں خود اعتمادی حاصل کی جائے گی۔ اس پالیسی کو اس امر کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ٹیکنالوجی کی منتقلی کے پہلو بہ پہلو سائنس کی منتقلی بھی ضروری ہے، نیز یہ کہ سائنس قومی مسائل کے حل کرنے میں، طب و صحت میں، زراعت میں، منصوبہ بندی میں، صنعت و حرفت میں اور دفاع میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سائنس کی تعمیری پالیسی بناتے وقت ہمیں جاپان کی مثال کو سامنے رکھنا چاہیئے، جس کے قابلِ ذکر عوامل درج ذیل ہیں :-

(ا) تعلیم و تحقیق کی ہر سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام شعبوں میں نوجوان نسل کو وسیع اور سخت تربیت دینا۔ تحقیق میں وسیع پیمانے کی تربیت کی مثال کے لئے برطانیہ کی طرف دیکھیئے، جس کی سائنس اور انجنیئرنگ ریسرچ کونسل پی ایچ ڈی ٹریننگ کے لئے پانچ ہزار جوانوں کو گرانٹ دیتی ہے۔ مزید پانچ ہزار جوانوں کو گرانٹ دوسری ریسرچ کونسلوں ــــ مثلاً زرعی تحقیقی کونسل، طبی تحقیقی کونسل، ماحولیاتی تحقیقی کونسل وغیرہ کی طرف سے ملتی ہے۔ پی ایچ ڈی کے بعد اعلیٰ تر تربیت کے لئے برطانیہ میں ہر سال ایک ہزار افراد کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ برطانیہ کی آبادی پاکستان کی آبادی سے نصف ہے۔

حکومتِ پاکستان نے اِس سال ۴۰۰ طلباء کو پی ایچ ڈی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک میں بھیجنے کا بندوبست کیا ہے۔ یہ انتہائی قابلِ تعریف اقدام ہے اور آئندہ برسوں میں بھی جاری رہنا چاہیئے، تاکہ گزشتہ رُبع صدی کی غفلت کی تلافی ہو سکے۔ اب پی ایچ ڈی کے بعد اعلیٰ تر تربیت کے لئے بھی ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر ضروری ہو تو بیرونی ممالک جانے والے منتخب طلباء کو سینیئر سائنسدانوں سے خصوصی تربیت دلوانے کا انتظام کیا جائے جیسا کہ ۱۹۱۸ء میں روس میں کیا گیا تھا۔ جن طلباء و طالبات کو بیرونی تربیت کے لئے منتخب کیا گیا تھا اُن کو سینیئر سائنس دانوں سے خصوصی تربیت دلوائی گئی تھی۔ اور یہ سارا انتظام جنگی بنیادوں پر کیا گیا تھا، تاکہ سائنس دانوں کا قحط الرجال جلد از جلد ختم کیا جا سکے۔

(ب) طویل المیعاد منصوبے کے طور پر اعلیٰ درجے کے تدریسی و تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں جن کو بعد جامعات سے ملحق کر دیا جائے۔ جامعات کی سائنس کو ترقی دینے کے لئے اور جامعات اور سرکاری تحقیقی اداروں کی باہمی رقابت کو دُور کرنے کے لئے ہمیں امریکی نظام کو اختیار کر لینا چاہیئے، جہاں وفاقی مالی امداد سے چلنے والے تحقیقی ادارے بھی لازماً جامعات سے ملحق ہوتے ہیں۔

۲۔ سائنس کے نظم و نسق کا پُرانا ڈھانچا تبدیل ہو جانا چاہیئے۔ سائنس کو فعّال سائنسدانوں کو فعّال سائنسدانوں کے لئے چلانا چاہیئے۔ افسر شاہی کو سائنس کے انتظام سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ ان بوڑھوں کو بھی سائنس کی گدی سے ہٹ جانا چاہیئے جن کی وجہ سے سائنس پر جمود آ چکا ہے۔

۳۔ ملک میں سائنس کی متعدد فاؤنڈیشنیں قائم ہونی

چاہئیں، جو سرکاری امداد سے بھی چلیں اور نجی عطیات اور اوقاف فنڈ سے بھی، تاکہ تحقیق کے لئے ہر ممکن ذریعے سے گرانٹ حاصل ہو سکے۔

۴۔ ہمیں اس امر کو یقینی بنانا چاہیئے کہ سائنس کے لئے ہماری تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی ہو۔ اس کے لئے بین الاقوامی مذاکرات، سیمینار، کانفرنس وغیرہ میں شرکت کے لیئے عام آزادی، ترغیبات، رخصت با تنخواہ، آنے جانے کے اخراجات، قیام وطعام کے اخراجات کا انتظام سرکاری طور پر ہونا چاہیئے۔

(۵) ہائی ٹکنالوجی کی ترقی کے لیئے بہتر ہوگا کہ پاکستان میں جاپان کی طرز پر "میتی" (وزارت صنعت و تجارت) قائم کی جائے۔ نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وزارت عملاً جاپان میں ہائی ٹکنالوجی کی ترقی کے لیئے وقف ہو کر کام کرتی ہے۔ اس وزارت کے تحت مستقبل کے سائنسی رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے یہ ہر ممکن طریقے سے سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی کا اہتمام کرتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سائنس دانوں کا قریبی اور مضبوط رابطہ صنعت کاروں، سرمایہ کاروں اور سرکاری مالیاتی اداروں سے پیدا کرتی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں اس وقت کی پاکستانی حکومت نے میری تجویز پر لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس سے درخواست کی کہ عالم اسلام کے لیئے کم از کم ایک "سائنس فاؤنڈیشن" قائم کی جائے، جو اپنے رتبے اور سائز کے لحاظ سے فورڈ فاؤنڈیشن کے ہم پلہ ہو، اور کم از کم ایک بلین ڈالر سے شروع کی جائے۔ درخواست کو منظور کر لیا گیا۔ آئندہ آٹھ سال خالی گئے۔ ۱۹۸۱ء میں سائنس فاؤنڈیشن بجائے ایک بلین کے ۵۰ ملین ڈالر کے "وعدے" سے قائم کی گئی۔ اور جہاں تک میرے علم میں ہے اب تک صرف ساڑھے چھ ملین ڈالر فاؤنڈیشن کو ملے ہیں۔ خود کو فریب دینے سے کہیں بہتر تھا کہ فاؤنڈیشن قائم ہی نہ کی جاتی۔

(۶) جہاں تک ہائی ٹکنالوجی کے سوا عام صنعتی تحقیق کا تعلق ہے، چونکہ ہماری بیشتر صنعتیں چھوٹی ہیں اس لیئے ہمیں چھوٹی صنعتی اکائیوں ــــ مثلاً چپس بنانا، کھیلوں کا سامان، چھری چمچے کانٹوں کی صنعت اور ایسی ہی دوسری چھوٹی صنعتوں کی ضرورتوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ہمیں برطانیہ اور مغربی یورپ کی طرح مشترکہ سرکاری و نجی امداد باہمی کے تحقیقی ادارے قائم کر لینے چاہئیں (رنگ روغن، کاسٹ آئرن، کٹلری، جیلاٹن اور گلیو، شیشہ، اسپرنگ، جوتے، فیتے، ہوزری، ویلڈنگ اور اون وغیرہ کی صنعتوں کی تحقیق و ترقی کے لیئے) برطانیہ میں ایسے مشترکہ اداروں میں چھ ہزار سائنس دان اور ہنرمند کام کرتے ہیں۔ یہ ادارے صنعتوں کی ضروریات ومفادات و خدمات کی بجا آوری پر ۱۰۰ ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں اور ۱۰۰ بلین کما کر دیتے ہیں۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم کیوں ملتان میں ٹائلوں کے لیئے، بہاولپور میں ظروف سازی کیلئے، گجرات میں سرامکس کے لیئے، سیالکوٹ میں آلات جراحی کے لیئے ایسے ادارے قائم نہیں کر سکتے، جو حکومت اور صنعت کاروں کے مشترکہ سرمایہ اور امداد باہمی سے خوش اسلوبی سے چلتے ہوں۔

(۷) پاکستان کی دُنیائے دانش پر شاعری اور غزل

کی ادبی روایت کا مکمل قبضہ رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم "حلقہ اربابِ سائنس" کی تحریک زور و شور سے شروع کریں اور اس کو نظریے، تجربے اور تخلیق و ایجاد کی سائنسی سرگرمیوں کا یکساں خیال رکھتے ہوئے ایک قومی علمی تحریک بنا دیں۔

بنیادی اور پہلی بات یہ ہے کہ حکومتِ وقت واضح طور پر سائنس پالیسی کا اعلان کرے مثال کے طور پر جنوبی کوریا کی طرح، ہم بھی قومی طور پر یہ عزم کر سکتے ہیں کہ رواں صدی کے اختتام تک ہم برطانیہ کی ہمسری کرنے لگیں گے۔

پاکستان کے لیے سائنس کی افادیت

میں سائنس اختیار کرنے اور سائنسی علم حاصل کرنے کے بارے میں اتنا جذباتی کیوں ہو رہا ہوں؟ محض اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کی آرزو ودیعت کر رکھی ہے، اس لیے بھی نہیں کہ فی زمانہ سائنس طاقت ہے اور ہماری مادی خوشحالی اور بامقصد و فارغ کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ عالمی برادری کے ایک عزتِ نفس رکھنے والے رکن ملک کی حیثیت سے پاکستان کو اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ عالمی سائنس کے تحقیقی و تخلیقی ذخائر سے ہم دیر سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ ہم پر دوسروں کا قرضہ ہے جو ہمیں بے باق کر دینا چاہیئے۔ ہمیں اس خاموش توہین کے تازیانوں سے بچنا ہوگا جو علم تخلیق کرنے والوں کی طرف سے ہم پر پڑتے رہتے ہیں۔

ایک یورپی ملک کے ایک نوبل انعام یافتہ طبیعیات داں کی ایک بات ہمہ وقت میرے دل کو کچوکے دیتی رہتی ہے۔ چند سال پہلے اُس نے اچانک مجھ پر ایک سوال لاد دیا: "سلام، کیا آپ کے خیال میں یہ واقعی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان اقوام کی دستگیری کرتے رہیں، ان کو مالی امداد دیتے رہیں، انھیں خوراک فراہم کرتے رہیں، اُن کو زندہ رہنے میں ہر وقت مدد دیتے رہیں جنھوں نے انسانی علمی ذخیرے میں ایک ذرّے کا بھی اضافہ نہیں کیا؟" اُس نے مجھ سے یہ سوال نہ کیا ہوتا تب بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ جب بھی میں کسی ہسپتال میں داخل ہوتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ آج کی زندگی بچانے والی تمام دوائیں دوسروں نے بنائی ہیں اور پاکستان کے سائنسدان کا ان کی ساخت و تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس تناظر میں میں نے بھارت، بنگلہ دیش اور ملائشیا کے علمائے کرام سے حال ہی میں سوال کیا تھا، قرآن مجید کا آٹھواں حصہ ــــ تقریباً ۷۵۰ آیات ایسی ہیں جن میں اہلِ ایمان کو قدرت کا مطالعہ کرنے، غور و فکر کرنے، عقل سے کام لینے اور حکمت و تدبر والی اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تو کیا آپ اپنے آٹھ خطباتِ جمعہ میں سے ایک خطبہ سائنس کے بارے میں دیتے ہیں؟ سب نے مجھے ایک ہی جواب دیا: "ہم چاہتے تو ہیں، لیکن ہم خود سائنس نہیں جانتے تو خطبہ کیا دیں گے!"

قرآن میں سائنس کے حوالے سے مجھے ایک عیسائی مصنف ہسٹن اسمتھ کی خوبصورت رائے یاد آگئی ہے

آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"ایک ایسے عہد میں جب دنیا پر مافوق الفطرت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، جب کراماتوں اور معجزوں کو معمولی سے معمولی صوفی سینٹ کا بھی حق سمجھا جاتا تھا، محمدؐ نے انسانی کمزوری اور ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ فال، شگون، بشارت، اشارۂ غیبی، کرامات اور معجزوں کے شوقین بت پرستوں کے لیئے آپؐ نے یہ کہہ کر معاملے کو بالکل صاف اور سیدھا کر دیا۔

" اللہ نے مجھے معجزے دکھانے کے لیئے نہیں بھیجا، اُس نے مجھے نیکی کی ہدایت اور صداقت کی تبلیغ کے لیئے بھیجا ہے۔ سب تعریفیں اسی کو سزاوار ہیں۔ کیا میں آدمی سے زیادہ کچھ ہوں، جسے رسول کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے؟"

اپنی پوری زندگی میں، شروع سے آخر تک آپؐ نے اپنی ذات کو آگے لانے کی ہر خواہش اور ہر تحریک کی مزاحمت کی۔ آپؐ نے فرمایا " میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، یا یہ کہ میں علم الغیب رکھتا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے"۔ اگر معجزوں ہی کی طرف دیکھنا ہے تو یہ محمدؐ کی بڑائی نہیں، اللہ کی بڑائی ہے اور اللہ کی بڑائی کو دیکھنے کے لیئے آنکھوں کا کھلا رکھنا ضروری ہے۔ آسمان کی پہنائی میں اجرام فلکی کا اپنے لگے بندھے ہموار رستوں پر چپ چاپ چلتے رہنا، کائنات کا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین حسنِ ترتیب، بارش جو مٹی کی پیاس بجھانے کو برستی ہے، درخت جن کی شاخیں سنہری پھول سے لدی جھکی رہتی ہیں، جہاز جو انسان کے فائدے کی چیزوں کا بوجھ اٹھائے سمندروں کے سینے پر تیرتے رہتے ہیں، کیا یہ سب کسی پتھر کے خدا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں؟ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے کسی اور کرامات کی خواہش کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ فوق الفطرت اور ضعیف الاعتقادی کے عہد میں محمدؐ نے دنیا کو مسلمات کا احترام کرنا سکھایا، جس نے مسلمانوں کو (عیسائیوں سے بہت پہلے) سائنس کی طرف مائل و بیدار کیا۔ محمدؐ نے صرف ایک معجزے کا دعویٰ کیا، اور وہ معجزہ خود قرآن ہے "۔

ہسٹن اسمتھ کی رائے کا اقتباس پیش کرنے کے بعد ایک سوال میں بھی کرتا ہوں: "کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں جدید سائنس کے غیر متنازعہ فیہ حصوں کو شامل کر لیا جائے؟ ___ مثلاً نیوٹن کے قوانین، ستاروں اور کہکشاؤں کی فلکی طبیعیات، قدرت کی بنیادی قوتوں کا علم، جینی کوڈ اور زمین کی ساخت وغیرہ۔

اب میں اس رام کہانی کو وہیں ختم کرتا ہوں جہاں سے میں نے شروع کی تھی۔ یہ کہ ہماری قوم اپنی صلاحیت و امکان کے اعتبار سے ایک عظیم قوم ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوم کی عظمت کا احساس نہیں ہے۔ اور ہم ایک چھوٹی قوم کے سے چھوٹے انداز میں عمل کرتے ہیں۔

ہمارے لوگ سائنسی علوم میں اعلیٰ درجے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صرف اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ میں ستارہ آنکھوں والے طوطے کی طرح رٹی رٹائی بات نہیں کہہ رہا۔ میں یہ بات پورے وثوق سے زندگی بھر کے طویل تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ جو مجھے مختلف اقوام کے سائنسدانوں کی تربیت اور رہنمائی کرنے سے حاصل ہوا ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹکنالوجی کے باب میں بھی، ہم زبردست صلاحیت کے مالک ہیں۔ جاپان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مہارت کا اطلاق، جو انہیں اپنے فنِ کتابت سے ورثے میں ملی تھی، آج کی ٹکنالوجی پر کیا ہے۔ کیا ایک ایسی قوم جو قرآن مجید کی پوری آیت چاول کے دانے پر لکھ سکتی ہے جب وہ مائکرو الیکٹرونکس کے میدان میں اُترے گی، تو کیا وہ جاپان جیسی ترقی حاصل نہیں کر سکتی؟

جب مَیں بچہ تھا تو یہ بات عام سُننے میں آتی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان حساب میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ آج صورتِ حال بدل چکی ہے۔ آج مشرقِ وسطیٰ کا بنک کاری کا تمام انتظام پاکستانی چلا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائی فرانسیسیوں کی طرح انفرادیت پسند ہوتے ہیں اور ہمیشہ سے اپنی ذات کی تشہیر اور بڑائی اُن کے لئے مہمیز کا کام دیتی رہی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ دانا حکومت اپنی پالیسی اس ترکیب سے بنا سکتی ہے کہ اس قدرتی انفرادیت پسندی کو کچلنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ یاد رہے کہ جب پاکستانی ملک سے باہر ہوتے ہیں تو انفرادیت پسندی کا لبادہ اُتار پھینکتے ہیں، اور مل جُل کر ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرنے کی شہرت پاتے ہیں۔

قوم کے کردار میں سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت و افادیت جتانے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ سب جانتے ہیں کہ سائنس آدمی میں کیا کیا اوصافِ حمیدہ پیدا کرتی ہے ــــ تکمیل، تحمّل، عمل پر افتخار، باریک بینی، اور سب سے زیادہ رواداری اور دوسروں کی رائے کا احترام کرنے کی قابلیت۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کوشش کرنے والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ایک دفعہ اپنی نوجوان نسل کی آتشِ شوق کو فتیلہ دکھانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر سائنس کا سلسلۂ تخلیق کبھی رُکے گا نہیں۔ جمال عبدالناصر کی طرح مَیں بھی اپنے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں "اپنا سر بلند کرو میرے بھائی، فخر و افتخار سے اور عزّتِ نفس سے"۔

مَیں اس دُعا کے ساتھ خاتمۂ کلام کرتا ہوں کہ مستقبل کا کوئی مؤرّخ یہ نہ لکھے کہ پندرھویں صدی ہجری میں ملکِ پاکستان میں سائنس کی صلاحیت تو بدرجۂ وافر موجود تھی، لیکن ایسے سیاسی رہنماؤں کا قحط تھا کہ جو اس صلاحیت کو پاکستان کے اندر، پاکستان کی خاطر، پاکستان کے لئے استعمال کر سکتے۔

(ماہنامہ طالب علم کراچی۔ جون ۱۹۸۷ء)

مکرم جنید ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ شام کے جھٹ پٹے میں بعض نوجوانوں نے حضرت نواب محمد عبداللہ خان صاحب کی کوٹھی کے باغ میں سے پھل توڑنے چاہے۔ آپ نے دیکھ لیا اور بلاتے ہوئے فرمایا کہ اندر آ کر پکے ہوئے پھل کھاؤ۔ آپ نے مسکراتے ہوئے سب کی جھولیاں پھلوں سے بھر دیں۔ یہ خاموش اور لطیف طرزِ نصیحت بہت موثر تھی۔"

رفقائے احمد جلد ۱۲ صفحہ ۱۴۶

سیرِ گلستان

مسافر نواز بہتیرے!

(تحریر:- ملک محمود احمد ناصر)

ہماری مجلس ہر سال مختلف علاقوں کے مطالعاتی دوروں کا اہتمام کرتی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جس جگہ کا انتخاب کیا گیا وہ انتہائی دلکش اور دلفریب قدرتی مناظر کے علاوہ تاریخی لحاظ سے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یعنی وادی سون کا خوبصورت تفریحی مقام "کلر کہار"۔

کلر کہار ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے جس کی خوبصورتی پھولوں اور پھلدار باغات کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں سیاحوں کے لیئے ایک ریسٹ ہاؤس اور ہوٹلوں میں کھانے کا معقول انتظام ہے۔ ہم رات کو وہاں پہنچے اور تھکاوٹ کی وجہ سے کھانا کھاتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ صبح کو ہلکی ہلکی پھوار سردی میں اضافہ کر رہی تھی۔ جمعہ کا روز تھا اور نماز کے لیئے ہم دوالمیال پہنچنا چاہتے تھے جو قریباً ایک گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے۔

کلر کہار کے نزدیک پہاڑی کی چوٹی پر حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کا مزار ہے جو موروں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ مزار کے قریب کئی مور گھومتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ مزار کافی بلندی پر واقع ہے اسلیئے یہاں سے دلکش ماحول کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ مزار سے ذرا نیچے ایک چشمہ بہہ رہا ہے اور تھوڑے فاصلے پر ایک جھیل ہے جس میں کشتی رانی کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ جھیل کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ اب زیادہ گہری نہیں رہی۔ چشمے کا پانی پائپوں کے ذریعے گھروں تک پہنچایا گیا ہے۔

کلر کہار کے مناظر قابلِ دید ہیں۔ مزار سے جھیل کی طرف جاتے ہوئے ایک سنگی چبوترہ نظر آتا ہے جو "تختِ بابری" کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے اُوپر کھڑے ہو کر شہنشاہ بابر نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم نے کشمیر فتح کر لیا ہے اور یہ علاقہ بھی کشمیر کا ہی بچہ ہے"

یہاں دوالمیال کے لیئے ہمیں دوپہر بارہ بجے کے بعد بس ملی۔ دوالمیال پہنچنے تک نمازِ جمعہ ہو چکی تھی۔ اور موسم کے تیور بگڑے ہوئے تھے، موسلادھار بارش ہونے لگی۔ دوالمیال کی آبادی آٹھ ہزار ہے۔ یہاں کی جماعتِ احمدیہ بہت مخلص جماعت ہے۔ احمدیہ بیت الذکر کافی وسیع اور بہت خوبصورت ہے۔ اس کے درمیان میں ایک خوبصورت مینار ہے جو ۱۹۲۹ء میں تعمیر کیا گیا۔ مینار نیچے سے چوٹی تک بجلی

کے قمقموں سے آراستہ ہے۔ ہم نے مینار کی چوٹی سے دوالمیال کا نظارہ کیا اور بہت لطف اندوز ہوئے۔

یہاں ہماری نظر کسی ہوٹل کو دیکھنے میں ناکام رہی جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہوٹل کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ہر آنے والے کو وہاں کے لوگ اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔ اور واقعتہً دوالمیال کے لوگ بہت ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے یہاں کے لوگ عموماً فوج میں جانا پسند کرتے ہیں اور کئی اعلیٰ فوجی افسران کا تعلق دوالمیال سے ہے۔

شام کو ہم سریا تیار کرنے کا ایک کارخانہ دیکھنے گئے جو میجر احمد سرتاج صاحب کی ملکیت ہے۔ محترم سرتاج صاحب ہانگ کانگ یونیورسٹی سے چینی زبان میں پوسٹ گریجوئیٹ ہیں اور بہت سادہ لیکن بلند پایہ عالم آدمی ہیں۔ ہمیں قریباً ایک گھنٹہ ان کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا اور اس دوران انہوں نے ہمیں اِس علاقہ کی تاریخی حیثیت سے آگاہ کیا۔

دوالمیال کے ایک بزرگ احمدی دوست ملک عبدالرشید صاحب نے بڑی محنت اور مستقل مزاجی سے بہت سی نادر اشیاء جمع کر کے ایک ذاتی عجائب گھر تشکیل دیا ہے اور اپنے ہی مکان کے (قریباً ۱۰×۱۰ فٹ کے) ایک کمرے میں یہ اشیاء بڑی خوبصورتی سے ترتیب دی ہیں۔ ان میں پرانے سکّے، اشرفیاں، ٹکٹیں، ماچسیں اور تصاویر کے علاوہ مارخور کا سر، خوبصورت پتھر، گھونگے، پہلی جنگِ عظیم کی یادگار تلوار اور ایسی ہی بہت سی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ مارخور کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بکرے کی طرح کا ایک جانور ہے جس کے دو۲ لمبے سینگ ہوتے ہیں۔ یہ سانپ کھاتا ہے اور بعد میں جگالی کرتا ہے جگالی کے دَوران اس کے مُنہ سے گرنے والی جھاگ کچھ عرصہ بعد پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے۔ اس جھاگ کا منکا بنایا جاتا ہے جو زہر چُوسنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عجائب گھر میں ایک ایسے بارہ سنگے کا سر بھی محفوظ ہے جس کے چودہ سینگ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ لاکھوں برس قبل کلر کہار اور دوالمیال کا علاقہ سمندر تھا۔ اس سمندر کی یادگار سیپ، گھونگوں اور فاسلز کی شکل میں موجود ہے۔ جب کوئی جانور لاکھوں برس زمین میں دبا رہنے کے بعد شکل تبدیل کیئے بغیر سخت ہو جاتا ہے تو اسے فاسلز (FOSSILS) کہتے ہیں۔ محترم ملک عبدالرشید صاحب نے آس پاس کی وادیوں میں گھوم کر بہت سے فاسلز بھی اکٹھے کیئے ہیں۔ اِس عجائب گھر کا منظر تین مرتبہ ٹی وی پر بھی ٹیلی کاسٹ کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ عجائب گھر صرف ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل ہے لیکن اِس میں موجود بہت سی تاریخی اور نادر اشیاء کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیئے کئی گھنٹے درکار ہیں۔ ہمیں وقت کی کمی کی وجہ سے بہت کم وقت اِس عجائب گھر میں گزارنے کا موقع ملا۔

ایک رات دوالمیال کی جماعت کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے بعد اگلے روز صبح ہم پیدل کٹاس کے لیئے روانہ ہوئے جو تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ دوالمیال کے دو دوست محمد احمد صاحب اور ملک عبدالحفیظ صاحب ہماری راہنمائی کیلیئے ہمراہ تھے۔ کٹاس، دوالمیال سے دو۲ میل کے فاصلہ پر ہے

قیامِ پاکستان سے قبل یہاں صرف ہندو آباد تھے اور یہ جگہ اُن کے لیئے بہت متبرک ہے اس لیئے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو بھی اس بستی میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ہمیں وہ کمرہ بھی دکھایا گیا جس میں مبیّنہ طور پر ہندوؤں کی مذہبی کتاب "گیتا" نازل ہوئی تھی۔ یہاں کی عمارتیں اور مندر جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تین ہزار برس پُرانے ہیں اب بھی بہت مضبوط ہیں۔ اِن کی تعمیر میں چُونا، دالوں کا آٹا وغیرہ استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک برساتی سیلاب کے باعث یہاں کی کچھ عمارتیں منہدم ہوگئی تھیں۔ عمارتوں کے درمیان میں ایک تالاب ہے جس کی گہرائی قریباً سو فٹ ہے۔ اِس تالاب میں ایک چشمہ ہے۔ یہ جگہ "کٹاس کا چشمہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندو اب بھی ہر سال خاص دنوں میں یہاں آتے ہیں اور اِس مقام کی زیارت کرنے کے بعد تالاب کا پانی ہمراہ لے جاتے ہیں۔ ایک بلند عمارت پر ہم چڑھے تو حسین مناظر سے مالا مال یہ علاقہ بہت خوبصورت لگا۔ پہاڑیوں میں بہت سی غاریں بنی ہوئی ہیں۔ رات کو انہی میں بیٹھ کر ہندو عبادت کیا کرتے تھے۔ کٹاس میں ایک انٹر کالج بھی ہے۔

کٹاس میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد ہم چوآ[۵] سیدن شاہ کے راستے کھیوڑہ جانے کے لیئے بذریعہ ویگن روانہ ہوئے۔ چوآ سیدن شاہ سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہُوا شہر ہے جو بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ ہر آدھ گھنٹہ بعد یہاں سے کھیوڑہ کے لیئے ایک بس مل جاتی ہے۔ گیارہ بجے دوپہر کو یہاں سے روانہ ہو کر ساڑھے بارہ بجے کھیوڑہ پہنچ گئے۔

کھیوڑہ میں دُنیا کی سب سے بڑی نمک کی کان ہے جس میں داخلہ بذریعہ پاس ہوتا ہے۔ جب ایک گائیڈ کے ہمراہ ہم کان کے اندر داخل ہوئے تو گرمیوں کے باوجود ہمیں ٹھنڈک کا احساس ہُوا۔ کان کا درجۂ حرارت بیرونی درجہ حرارت کے اُلٹ ہوتا ہے یعنی موسم سرما میں گرم اور گرمیوں میں سرد۔ ہمارے گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ اِس کان سے نمک نکالنے کا کام ۳۲۷ ق م میں شروع ہُوا تھا۔ اِس کان کی اِس وقت چونتیس منزلیں ہیں اور اِس کا رقبہ ایک سو مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ نمک کے اخراج کیلئے بہت عرصہ تک کوئلے کی گاڑی استعمال ہوتی رہی اور ۱۹۲۶ء میں یہاں بجلی پہنچنے کے بعد سے بجلی کی گاڑی استعمال ہو رہی ہے۔ کان کے اندر ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے اور اُوپر بجلی کی تاریں گزر رہی ہیں۔ اگرچہ جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن تھے لیکن اس کے باوجود اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔

ہمارے گائیڈ نے ہمیں کان میں چوتھی منزل کے کچھ حصّہ کی سیر کروائی۔ تین منزلیں نیچے اور تیس اُوپر تھیں۔ گائیڈ نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ پہاڑ کو سہارا دینے کے لیئے کان مسلسل نہیں کھودی جاتی بلکہ ہر پینتیس ۳۵ فٹ کی کھدائی کے بعد ۳۵ فٹ کی ہی ایک دیوار چھوڑ دی جاتی ہے۔ پہاڑ کو سہارا دینے کے لیئے کان کے اندر لکڑی اور لوہے کے گارڈر بھی استعمال کیئے گئے ہیں۔ کان کے اندر بڑے بڑے ہال ہیں جن کی چھتیں پچاس فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں اور بڑے بڑے کئی تالاب ہیں جو اسّی فٹ سے بھی

---

[۵] چوآ مقامی زبان میں چشمے کو کہتے ہیں۔

زیادہ گہرے ہیں۔ ان تالابوں میں اُن چشموں کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے جو کان میں بہت سی جگہوں سے اُبل رہے ہیں۔ چشموں کا پانی کان کی ایک دیوار کے ساتھ بنی ہوئی نالی کے ذریعہ سے تالابوں میں گرتا ہے اور پھر موٹر پمپ کے ذریعے مختلف فیکٹریوں کو بھیجا جاتا ہے کئی جگہوں پر بظاہر بہت نرم لیکن دراصل پتھر کی طرح سخت نمک کے تودے نظر آتے ہیں۔ ان کے بننے کی وجہ وہ قطرہ قطرہ چھت سے رسنے والا نمکین پانی ہے جو نمک چھوڑ کر خشک ہو چکا ہے۔ تالاب میں پانی انتہائی شفاف ہوتا ہے لیکن اگر اس کو چکھا جائے تو ذائقہ میں نہایت کڑوا ہے۔ بعض تالابوں پر کئی کئی فٹ لمبے پُل بھی بنائے گئے ہیں۔ برسات کے موسم میں پہاڑ کمزور ہو جانے کے باعث کھدائی ملتوی کر دی جاتی ہے۔

کان کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بنائی گئی ہے جس کی دیواریں نمک کی اینٹوں سے چُنی گئی ہیں۔ اور ان اینٹوں کے درمیان بجلی کے بلب لگائے گئے ہیں۔ جب یہ بلب روشن کئے جاتے ہیں تو نمک سے تراشی ہوئی ہر اینٹ کا اپنا رنگ واضح ہو جاتا ہے اور یہ نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ نمک کو توڑنے کے لئے بارود بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کان سے اب تک لاکھوں ٹن نمک نکالا جا چکا ہے اور ابھی تک اس قدرتی خزانہ کا اختتام نظر نہیں آتا۔ ہر سال ہزاروں لوگ اس نعمتِ خداوندی کے عظیم ذخیرہ کو دیکھنے یہاں آتے ہیں اور مختلف جگہوں پر اپنی تصاویر بنواتے ہیں۔

نمک کی کان دیکھنے کے بعد بذریعہ ریل گاڑی ہم ملکوال سے ہوتے ہوئے رات واپس ربوہ پہنچ گئے۔

کینسر اور اس کا سدِّباب

(ڈاکٹر عارف آصف بھٹو۔ ایم بی بی ایس۔حیدرآباد)

ایسے امراض جو انسان کو کافی حد تک نہ صرف محتاج بنا دیتے ہیں بلکہ جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں ان میں کینسر سرِفہرست ہے۔ کینسر آج کے سائنسی دور کی وہ واحد بیماری ہے جسے تشخیص کرنے کے لیے مریض کو کئی مراحل سے گزارا جاتا ہے اور پھر اس کا علاج آج بھی ڈاکٹروں کے لیے کسی معمہ سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کینسر کا نام ہی مریض اور اس کے عزیز و اقارب کو مایوس کرنے کے لیے کافی ہے۔ آئیں ذرا غور کریں کہ کینسر ہے کس بلا کا نام؟

کینسر کیا ہے؟

کینسر جس کا مطلب کچھوا ہوتا ہے دراصل اندرونی نظام کی بیماری ہے جس میں کسی نامعلوم وجہ سے جسم کے کچھ خلیئے (CELLS) جو عام حالت میں منظم ہو کر اپنا مخصوص اور نہایت اہم کام انجام دیتے ہیں، یکایک جسمانی نظم و ضبط کے قابو سے نکل کر اک عجیب سی بے قاعدگی کا ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ باغی خلیئے عام خلیوں سے الگ اور بہت مختلف سی اک کالونی بنا لیتے ہیں اور یہ خلیئے ان صحتمند خلیوں کی غذا حاصل کر کے جن سے جسم کی افزائش ہوتی ہے اور توانائی برقرار رہتی ہے اپنی تعداد میں مسلسل اضافہ کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ کسی غدود، گلٹی یا گانٹھ کی صورت میں جسم کے کسی بھی حصے میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ پس خلیوں کی اس غیر ضروری اور غیر منظم افزائش کو کینسر یا سرطان کہا جاتا ہے۔

ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کینسر کو اس بدتمیز اور شریر بچے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو اپنے گھر کا لاڈلا ہے لیکن جس کو بیٹھے بٹھائے شرارت سوجھتی ہے۔ کوئی بچہ تو معمولی شرارت سے چھوٹا موٹا نقصان پہنچاتا ہے لیکن کچھ بچے آگے چل کر بدمعاش بن جاتے ہیں اور مجرمانہ حرکتوں پر اُتر آتے ہیں۔ سرطان کی بھی اسی طرح سے دو اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک خاموش طبع ہے جو نہ تو زیادہ بڑھتی ہے اور نہ ہی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس دوسری "بدترین" ہے جو کسی پیشہ ور مجرم کی طرح ادھر اُدھر ہاتھ مارتی ہے۔ یعنی کینسر کی یہ قسم جسم کے مختلف حصوں میں پھیل کر ان کا نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔

اسباب:۔

کسی سرطان کے مریض میں مرض کی اصل وجہ جاننا نہایت مشکل کام ہے پھر بھی مجموعی طور پر مندرجہ ذیل اسباب کینسر پیدا کر سکتے ہیں:۔

۱۔ کچھ موروثی اثرات سرطان کو جنم دے سکتے ہیں۔

مثلاً خلیوں میں 'AHH' انزائم کی زیادتی، پھیپھڑوں کا سرطان پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح بڑی آنت کے کچھ سرطان بھی موروثی اثرات ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۲۔ کچھ مخصوص غذاؤں اور سرطان کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ مثلاً چاول (RICE) جاپانیوں میں، تلی ہوئی غذائیں ویلز کے لوگوں میں، اناج پہ مشتمل غذائیں فن لینڈ میں اور بھنی ہوئی مچھلی آئس لینڈ کے باشندوں میں معدہ کے کینسر کا باعث بنتی ہے۔

۳۔ وائرس کی چند مخصوص اقسام جگر کا سرطان پیدا کر دیتی ہیں۔

۴۔ ایک ہی جگہ رگڑ یا بار بار چوٹ لگنے سے، یا کسی پرانے زخم یا چوٹ کے نشان یا تل سے بھی کینسر ہو سکتا ہے

۵۔ سگریٹ نوشی سے پھیپھڑوں کے سرطان، پان کھانے سے ہونٹوں اور اندرونی منہ کے کینسر کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

۶۔ انسانی جسم میں بعض ہارمون کی کمی یا بیشی بھی سرطان کو جنم دیتی ہے۔

۷۔ کئی پیشے بھی سرطان کا موجب بنتے ہیں، مثلاً کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں پھیپھڑوں کے سرطان، ربڑ کی صنعتوں کے کارکنوں میں مثانہ کے سرطان اور اخباری کارکنوں اور لوہے کی صنعتوں میں کام کرنے والوں میں پھیپھڑے اور اس کی نالیوں کے سرطان کے خدشات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

کینسر کوئی چھوت کی بیماری نہیں لہذا مریض کے قریب جانے والوں یا اس کے ہمراہ کھانے والوں کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے۔

چند خطرناک علامات :- بعض اوقات کینسر کی کچھ اقسام اندر ہی اندر مریض کا کام تمام کر دیتی ہیں۔ لیکن مریض میں علامات بہت دیر بعد ظاہر ہوتی ہیں۔ لہذا علامات کے ظہور سے قبل تشخیص اور علاج مریض کی زندگی میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ ایک سرطان کے مریض میں مندرجہ ذیل علامات پائی جاتی ہیں :-

۱۔ جسم کے کسی بھی حصے میں خصوصاً ہونٹ، زبان، پستان، جلد یا چربی کی تہہ میں گلٹی کا مسلسل موجود ہونا۔

۲۔ منہ سے الٹی یا کھانسی کے ذریعے یا پاخانے کے ہمراہ خون کا خلافِ معمول اخراج۔

۳۔ مریض کا پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو جانا اور وزن میں غیر معمولی کمی کا واقع ہو جانا بھی خطرے کی گھنٹی ہوتا ہے۔

۴۔ منہ، گلے، زبان یا معدے کا پرانا زخم جو باوجود علاج و احتیاط کے مندمل نہ ہو سکے کینسر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

۵۔ بھوک کا بالکل غائب ہو جانا اور نظامِ انہضام میں گڑبڑ کا واقع ہو جانا۔

۶۔ جسم پر پہلے سے موجود تل یا مسے کا یکایک بڑھ جانا۔

۷۔ مسلسل کھانسی، گلے کا درد، آواز کا بھاری پن، نگلنے میں دقت دراصل گلے کے سرطان کی جانب

اشارہ کرتے ہیں۔

۸۔ پیشاب اور پاخانے کے معمول میں غیر معمولی تبدیلی کا واقع ہونا۔

کینسر کا جسم میں پھیلاؤ:- دراصل ابتدائی شکل میں کینسر ایک نرم، متحرک اور چھوٹی سی گلٹی کی شکل میں ہوتا ہے جس کے گرد ایک خول یا کیپسول ہوتا ہے۔ یہ دراصل کم خطرناک صورت ہوتی ہے جسے میڈیکل سائنس میں 'BENIGN TUMOR'، بنائین ٹیومر کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کے حجم اور وزن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ بے شکل کا بے قاعدہ اور ٹھوس جسم بن جاتا ہے۔ اب اس میں درد بھی ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس کے خلیئے کیپسول کو توڑ کر خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ MALIGNANT CELLS جو کہ اب 'حقیقی کینسر کے خلیئے' کہلاتے ہیں بذریعہ خون دل، پھیپھڑے اور ہڈیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور پورے جسم کے کسی بھی حصہ میں کینسر کی علامات کو جنم دیتے ہیں۔

خون کے علاوہ لمف کی نالیوں کے ذریعے بھی کینسر کے خلیئے جسم میں پھیلتے ہیں۔ کچھ بھی سہی کینسر کا پھیلنا ایک انتہائی خطرناک اور جان لیوا امر ہے۔

تشخیص:- یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سرطان کا حملہ دراصل اُس وقت مریض پر ہوتا ہے جب اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ یا اس سے زیادہ ہو۔ البتہ چند قسم کے سرطان بچوں میں یا نوجوانی کے دَور میں ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بچوں میں خون کے خلیوں کا سرطان اور نوجوانوں میں ہڈی کے سرطان کی مثالیں عام ہیں۔

لیبارٹری میں دیگر ٹیسٹ کرنے کے علاوہ مریض کی 'BIOPSY' کی جاتی ہے جس کے تحت گلٹی سے کچھ خلیئے نکال کر اُنہیں خورد بین کی مدد سے یہ معلوم کرنے کے لیئے دیکھا جاتا ہے کہ آیا ان میں وہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں یا نہیں جو کہ کسی سرطان کے خلیئے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

علاج:- سرطان ایک جان لیوا مرض ہی سہی لیکن لاعلاج نہیں۔ ابتدائی تشخیص، بہتر اور مکمل علاج کی ضمانت ہے۔ سرطان کے علاج کا انحصار سرطان کی قسم، اس کے پھیلاؤ کی حد، عضو کی قوتِ مدافعت اور مریض کی طبعی حالت پر ہوتا ہے۔

سرطان کا علاج مندرجہ ذیل تین طریقوں پر کیا جاتا ہے:-

۱۔ سرجری:- آپریشن تھیٹر میں آپریشن کے ذریعے سرطان زدہ حصّے کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔

۲۔ ریڈی ایشن:- مختلف قسم کی شعاعوں کے ذریعے کینسر کے خلیوں کو ناکارہ کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ ادویات:- چند مخصوص ادویات جو مارکیٹ میں دستیاب ہیں کافی حد تک کارگر اور مفید ثابت ہوئی ہیں۔

۴۔ سرطان کے علاج کے سلسلہ میں مزید تحقیقات جاری ہیں ؎

مژدۂ نصرت جہاں

(مکرم چوہدری شبیر احمد صاحب)

گزشتہ سال عیدالفطر کے موقع پر حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رؤیا بیان فرمایا تھا جس میں آپ کی حضرت اماں جان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر خاکسار نے چند اشعار کہے تھے۔ جو حضور کی خدمت میں ارسال کئے تھے۔ گزشتہ دنوں "خالد" کے ایک شمارہ پر نظر پڑی جس میں اسی رؤیا کا ذکر تھا تو خاکسار کو یہ نظم یاد آگئی اور خالد کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

اِک شمعِ فروزاں کی خاطر بے تاب تھے اس کے پروانے
وہ ڈھونڈ چکے تھے شہروں میں وہ دیکھ چکے تھے ویرانے

بے چین تھی شمعِ فروزاں بھی کب دیکھوں گی پروانوں کو
طرفین کے سینوں میں دل تھے کہ چھلک رہے تھے پیمانے

بالآخر قسمت جاگ اُٹھی اُن دیوانے پروانوں کی
خود ہو گئی شمع عیاں لیکن کس طور؟ یہ راز خدا جانے

مانندِ ملائک متبسّم تھا شمعِ فروزاں کا چہرہ
نازاں ہوئے اپنی قسمت پر شاداں ہوئے سارے پروانے

یہ رؤیا مژدہ نصرت ہے اب سارے جہاں کے گوشوں میں
خود قادرِ مطلق آئے گا ..... کے عَلَم کو لہرانے

اخبارِ مجالس

آگے قدم بڑھائے جا!

اجتماعات

فیصل آباد ۳۰، ۳۱ر جولائی ۱۹۸۷ء سالانہ تربیتی اجتماع منعقد ہوا۔ کُل تین اجلاسات منعقد ہوئے جن میں حاضرین کو مختلف دینی مسائل یاد کروائے گئے۔ ۳۱ر جولائی کو نماز تہجد ادا کی گئی۔ نیز علمی مقابلہ جات بھی کروائے گئے۔

ضلع قصور ۱۶، ۱۷ر اپریل ۱۹۸۷ء اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں بزرگانِ سلسلہ نے علمی و تربیتی تقاریر کیں۔ اور خدام کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔ خدام کی کل ۱۲ر مجالس میں سے ۹ مجالس اور اطفال کی ۱۱ر مجالس میں سے ۶ مجالس نے شرکت کی۔ کُل حاضری ۱۵۰ رہی۔

ضلع بھکّر ۳۱ر جولائی ۱۹۸۷ء خدام الاحمدیہ کا اجتماع منعقد ہوا۔ دورانِ اجتماع حضور ایدہ اللہ کی ویڈیو کیسٹ دکھائی گئی نیز مرکزی نمائندگان نے تربیتی تقاریر کیں۔ اس اجتماع میں ۱۸ر خدام، ۱۴ر اطفال، ۹ر انصار، ۱۰ر لجنات اور ۷ر ناصرات نے شرکت کی۔

تربیتی کلاسیں

کھوکھر غربی ۳۱ر جولائی ۱۹۸۷ء بروز جمعۃ المبارک اطفال و خدام کی یک روزہ تربیتی کلاس منعقد ہوئی۔ کلاس کے دوران مختلف علمی و ورزشی مقابلہ جات ہوئے۔ اختتامی تقریب میں اوّل و دوم آنے والے اطفال و خدام میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ حاضری سو فیصد رہی۔

متفرق

اورنگی ٹاؤن کراچی ممبرانِ عاملہ کے دو اجلاسات ہوئے۔ مؤرخہ ۱۷ر جولائی کو "یوم صفائی" منایا گیا۔ جس میں ۱۱۹ خدام نے حصّہ لیا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۸۷ء کو مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی۔ ۳۱ر جولائی کو تقریری مقابلہ کروایا گیا۔ ایک خادم نے خون کا عطیہ دیا۔ شعبۂ مال میں -/۵۰۰ اروپے وصول کی گئی۔

فری کوچنگ کلاس ۱۹۸۷ء

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ ہر سال فری کوچنگ کلاس ایف اے / ایف ایس سی کے طلباء کے لیے منعقد کرتی ہے۔ امسال بھی ۱۱ر جولائی کو اس کلاس کا آغاز ہوا۔ یہ کلاس جامعہ احمدیہ میں منعقد کی گئی۔ اس کلاس کا افتتاح مکرم پروفیسر سلطان اکبر صاحب نے کیا۔ کلاس میں کُل ۹۰ طلباء نے شرکت کی فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی الگ الگ کلاسز لگائی گئیں (باقی صفحہ ۳۸ پر)

فری کوچنگ کلاس۔

کلاس روزانہ ۴۵-۶ پر شروع ہوتی تھی۔ کلاس میں روزانہ میتھ، بیالوجی، فزکس، کیمسٹری، انگریزی گرائمر، اکنامکس اور شماریات کے مضامین پڑھائے جاتے رہے۔ سائنس کے مضامین کے پریکٹیکلز بھی کروائے گئے۔

کلاس کے دوران کل تیرہ ۱۳ احباب نے تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ روزانہ ایک پیریڈ جنرل نالج کا ہوتا تھا جس میں ۱۵ اہلِ علم حضرات نے مختلف دینی علوم پر لیکچر دیئے۔

۲۸ جولائی کو کلاس کے اساتذہ کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ ۳۰ جولائی کو کلاس کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں حضرت مولوی محمد حسین صاحب نے اختتامی خطاب فرمایا اور دعا کروائی۔

آخری صفحہ

ایمان کی فکر

جماعت احمدیہ کے پہلے امام حضرت مولانا نورالدین صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ مَیں نے کسی شخص سے ایک زراعتی کنوئاں ساڑھے تین ہزار روپیہ میں رہن لیا۔ مگر مَیں نے اس سے نہ کوئی رسید لی اور نہ کوئی تحریر کروائی۔ اور کنوئاں بھی اسی کے قبضہ میں رہنے دیا۔ کچھ عرصہ بعد مَیں نے اُس کنوئیں کی آمد کا مطالبہ کیا تو وہ صاف منکر ہو گیا اور رہن کا بھی انکار کر بیٹھا۔ کسی نے یہ خبر حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ تک پہنچا دی اور مولوی صاحب کے نقصان پر افسوس کیا۔ مگر حضرت صاحب نے فرمایا: تمہیں اس کے نقصان کی فکر ہے مجھے ایمان کی فکر ہے۔ مولوی صاحب نے کیوں دوسرے شخص کو ایسی حالت میں رکھا جس سے اسکو بد دیانتی کا موقع مِلا اور کیوں قرآنی حکم کے مطابق اس سے کوئی تحریر نہ لی اور کیوں اس سے باقاعدہ قبضہ حاصل نہ کیا۔

(سیرت المہدی جلد اوّل صفحہ ۱۶)

(مرسلہ: مشہود احمد ظفر۔ لاہور)

قرارِ دادِ تعزیت

بروفات

محترم چوہدری انور حسن صاحب

ہم ممبران مجلسِ عاملہ خدام الاحمدیہ مرکزیہ مکرم چوہدری انور حسن صاحب نائب وکیل التصنیف برادر اکبر مکرم چوہدری سلطان احمد صاحب مہتمم صنعت و تجارت کی اچانک وفات پر نہایت غم والم کا اظہار کرتے ہیں۔

مکرم چوہدری صاحب مرحوم سنہ ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ والدین نے آپ کی پیدائش پر ہی آپ کی زندگی وقف کر دی تھی۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں اسلامیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اِس دَوران خدام الاحمدیہ مرکزیہ میں کچھ عرصہ بطور قائم مقام مہتمم مقامی ربوہ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں آپ بطور ٹیچر سیرا لیون چلے گئے۔ پہلے فری ٹاؤن رہے۔ پھر بو میں پرنسپل مقرر ہوئے بعد ازاں جورو میں بطور پرنسپل تعینات رہے۔

سنہ ۱۹۸۲ء میں بوجہ بیماری واپس بُلا لیا گیا اور بطور نائب وکیل التصنیف تقرری ہوئی۔

۱۸/ اگست سنہ ۱۹۸۷ء بروز منگل صبح پونے تین بجے آپ اپنے مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے۔

مکرم چوہدری صاحب مرحوم نہایت کم گو، منکسر المزاج، ملنسار اور بے لوث خدمت گزار تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ چوہدری صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آپ کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور خود اُن کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

والسّلام

ہم ہیں ممبرانِ مجلس عاملہ خدام الاحمدیہ مرکزیہ

Monthly KHALID RABWAH

Regd. No. L5830

SEPTEMBER 1987